اسلام اور انسانی حقوق

— اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں

ابو عمار زاہد الراشدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

اسلام اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں

محاضرات:

ابوعمار زاہد الراشدی

ضبط و تحریر:

ناصر الدین خان عامر

الشریعہ اکادمی

(سلسلہ مطبوعات:۱۹)

کتاب:	اسلام اور انسانی حقوق-اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں
مقرر:	ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب:	ناصر الدین خان عامر
ناشر:	الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
اشاعت اول:	اکتوبر ۲۰۱۱ء
قیمت:	۱۲۵ روپے

تقسیم کار:

مکتبہ امام اہل سنت	جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ (0306-6426001)
کتاب سرائے	الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور (042-37320318)
دارالکتاب	6/A، یوسف مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور (042-37235094)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی ملک کے بڑے تعلیمی اداروں میں سے ہے جو پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی دامت برکاتہم کے زیر اہتمام ایک عرصہ سے علمی، دینی اصلاحی اور دعوتی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ پاکستان شریعت کونسل کا ہیڈکوارٹر بھی وہی ہے اور میری وقتاً فوقتاً وہاں حاضری ہوتی رہتی ہے۔ جامعہ انوار القرآن کے شعبہ تخصص اور دارالافتاء کے سربراہ مولانا مفتی حماد اللہ وحید حفظہ اللہ تعالیٰ ایک باذوق اور باہمت عالم دین ہیں۔ ان کی ہمیشہ خواہش بلکہ اصرار رہتا ہے کہ میں جب بھی انوار القرآن میں آؤں، تخصص کے طلبہ کے ساتھ نشست میں کسی نہ کسی موضوع پر ان سے ضرور بات کروں اور میں بحمد اللہ تعالیٰ ان کے اس ارشاد کی حتی الوسع تعمیل بھی کرتا ہوں۔

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے موقع پر ۱۸ تا ۲۱ فروری ۲۰۰۸ء کو تین چار دن کے لیے جامعہ انوار القرآن میں حاضری ہوئی تو مفتی حماد اللہ وحید نے پروگرام کو وسعت دے کر دیگر بہت سے مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی شامل کر لیا اور مسلسل کئی نشستوں میں ان کے سامنے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کو جو مجموعی طور پر کم و بیش آٹھ نو گھنٹوں پر مشتمل ہے، مفتی صاحب موصوف نے آڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے سی ڈی پر محفوظ کر لیا، جبکہ میرے چھوٹے بیٹے ناصر الدین خان عامر سلمہ نے اسے سی ڈی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے زیر نظر کتابچہ کی صورت میں مرتب کر دیا ہے جسے

نظر ثانی کے بعد زیر نظر کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

''انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات'' گزشتہ ربع صدی سے میری تحریر و تقریر کا اہم موضوع چلا آ رہا ہے اور جہاں بھی مناسب موقع ہوتا ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور عرض کرتا ہوں۔ مگر میرے نزدیک یہ ابھی ابتدائی کاوش ہے جسے انسانی حقوق کی موجودہ عالمی صورت حال پر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے تعارفی تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ اصل ضرورت اس موضوع پر تفصیلی علمی و تحقیقی کام کی ہے جس کا بار کوئی بڑا علمی ادارہ ہی اٹھا سکتا ہے اور میں اس کے لیے بہت سے بڑے بزرگوں کا دروازہ کھٹکھٹا چکا ہوں۔

شاید کہ اتر جائے کسی دل میں مری بات

قارئین سے درخواست ہے کہ ہمارے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ یہ حقیری سی کاوش قبول فرمائیں اور اسے کسی بہتر اور مفید علمی کام کا ذریعہ بنا دیں۔ آمین یارب العالمین

ابوعمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

۱۲/اکتوبر ۲۰۱۱ء

اسلام میں انسانی حقوق کا تصور

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین۔ وعلیٰ آلہ وازواجہ واتباعہ اجمعین ۔ اما بعد۔

حضرات طلبہ کرام!

یہ تین دن کا جو پروگرام ہے، اس میں گفتگو کا عنوان آپ حضرات کے علم میں ہوگا: ''اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اسلامی تعلیمات''۔ آج دنیا میں انسانی حقوق کے اس اعلامیہ کے حوالہ سے بہت سے علمی، فکری، دینی مسائل چل رہے ہیں اور ایک غزو فکری، ایک نظریاتی جنگ جاری ہے جس کو ثقافتی جنگ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سولائزیشن وار ہے۔ اس کو عقیدے کی جنگ بھی کہہ دیتے ہیں۔

اس وقت جو غزو فکری مسلمانوں اور مغرب کے درمیان ہے، اس کی بنیاد اقوام متحدہ کے اس چارٹر پر ہے۔ اس کے حوالے سے اسلام کے بہت سے احکام وقوانین پر اعتراضات کیے جاتے ہیں اور ان اعتراضات کے ذریعے سے دنیا میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا راستہ روکا جا رہا ہے اور ان کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مخالفت کرنے والوں میں غیر مسلم طاقتیں تو ہیں ہی، بہت سے مسلمان حلقے جو مسلمان امت میں ہیں، مسلمان ممالک میں رہتے ہیں، وہ بھی اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مسلم ممالک میں اسلامی احکام وقوانین کا نفاذ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی مخالفت کی بنیاد بھی اقوام متحدہ کا یہی چارٹر ہے، اس لیے میں اہل علم سے یہ گزارش کیا کرتا ہوں کہ

اس کا پس منظر، اس کی نوعیت اور اس کی تفصیلات ہمیں معلوم ہونی چاہئیں کہ ہمارا مغرب کے ساتھ فکری معرکہ اور ثقافتی جنگ کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، اس کا پس منظر کیا ہے اور اس کا پیش منظر کیا ہے۔ یہ گفتگو کا ایک مستقل موضوع ہے۔ جب علما، اساتذہ اور طلبہ سے بات ہوتی ہے تو میں یہ گفتگو اکثر کیا کرتا ہوں۔ میرا زیادہ تر موضوع گفتگو انسانی حقوق کے نام پر جاری یہ جنگ ہی ہوتی ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت کچھ حق کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ دین حق کے حوالے سے اور حق کے حوالے سے جو باتیں علم میں آئیں، سمجھ میں آئیں، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی اور اس مقصد کی خدمت کی توفیق بھی نصیب فرمائیں۔

انسانی حقوق کا اسلامی فلسفہ

یہ جنگ انسانی حقوق کے نام سے لڑی جا رہی ہے۔ بنیادی موضوع ہیومن رائٹس کا ہے۔ اس گفتگو میں پہلے ہم یہ سمجھیں گے کہ اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے۔ اس کے بعد ہم آج کی دنیا میں انسانی حقوق کے تصور پر بات کریں گے۔ پھر ہم اقوام متحدہ کے اس چارٹر پر بحث کریں گے کہ کون کون سی جگہ پر اسلامی تعلیمات کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہے۔

سب سے پہلے میں واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ انسانی حقوق کا ہمارا تصور کیا ہے اور مغرب کا تصور کیا ہے۔ انسانی حقوق ہمارے ہاں بھی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی حقوق بیان کیے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس پر بات کی ہے۔ آپ کو بیسیوں احادیث میں حقوق کا تذکرہ ملے گا، بلکہ شمار کیا جائے تو سیکڑوں تک جا پہنچیں گی۔

ایک فرق تو اصطلاح کا ہے۔ ہمارے ہاں حقوق کا لفظ دو حوالوں سے بولا جاتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لکل أن یصطلح۔ ہر ایک کی اپنی اصطلاح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اصطلاح حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ہے۔ آپ کو قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں سیکڑوں نہیں، ہزاروں صفحات ملیں گے جن میں حقوق اللہ اور حقوق العباد پر بحث کی گئی ہے۔ مغرب کی اصطلاح ہیومن رائٹس (انسانی حقوق) کی ہے۔ مغرب حقوق اللہ پر کوئی بات نہیں کرتا، صرف حقوق العباد

پر بات کرتا ہے اور وہ بھی باہمی حقوق پر۔

ہمارا حقوق کا تصور کیا ہے؟ قرآن کریم کی مختلف آیات میں حق کا لفظ بولا گیا ہے۔ بنیادی طور پر حق کے دو معنی ہیں۔ایک حق ہے باطل کے مقابلے پر۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ۲:۴۲) یہاں حق کا لفظ باطل کے مقابلے پر ہے۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل۱۷:۸۱) یہاں بھی حق، باطل کے مقابل کے معنی میں ہے۔ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ (الانعام۶:۶۶) ایک جگہ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ۵:۴۸) کے الفاظ ہیں۔اسی طرح اور آیات بھی ہیں جن میں حق اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حق کا دوسرا مطلب باہمی حقوق یعنی ایک فرد پر دوسرے فرد کے حق کے حوالے سے ہے۔ مثلاً: وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذاریات۵۱:۱۹) ایک جگہ ہے: وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (بنی اسرائیل۱۷:۲۶)۔ درج ذیل آیات میں بھی لفظ 'حق' انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (البقرہ۲:۱۸۰)

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (البقرہ۲:۲۳۶)

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (البقرہ۲:۲۴۱)

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام۶:۱۴۱)

ان آیات میں حق کا لفظ باہمی حقوق کے حوالے سے استعمال ہوا ہے۔گویا قرآن کریم میں حق کا لفظ باطل کے مقابلے میں بھی استعمال ہوا ہے اور باہمی حقوق کے حوالے سے بھی۔قرآن کریم نے جہاں حقوق العباد کا ذکر کیا ہے، وہیں حقوق اللہ کا بھی ساتھ ذکر کیا ہے۔مثلاً میں دو مقامات کی

نشان دہی کروں گا جہاں اللہ رب العزت نے حقوق العباد اور حقوق اللہ کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوا بِهٖ شَيۡـئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ (النساء۴:۳۶)

یہاں پہلا حق کس کا بیان ہوا ہے؟ وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوا بِهٖ شَيۡـئًا۔ اس کے بعد ماں باپ کا، قریبی رشتہ داروں، یتیموں اور مسافروں کا ذکر ہے۔ اللہ کا بھی حق ہے اور بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳) اس آیت میں آگے اور لوگوں کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ ایک جگہ ہے:

وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ، وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ (لقمان: ۱۳،۱۴)

تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ قرآن کریم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا اکٹھے ذکر کیا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

اسلام کا اس حوالے سے مزاج کیا ہے؟ یہ سمجھانے کے لیے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ بخاری شریف (رقم: ۱۸۴۲) کی روایت ہے۔ بہت دلچسپ واقعہ ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ جب مدینہ منورہ آئے تو ایک یہودی خاندان کے غلام تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی دنوں مدینہ پہنچے تھے۔ قبا میں ان کی ملاقات ہوئی۔ حضرت سلمان فارسیؓ حق کی تلاش میں تھے۔ یہودی خاندان سے مکاتبت کر کے آزاد ہوئے۔ جب آزاد ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو اس وقت ان کی حیثیت مہاجر کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کرائی تو حضرت سلمان فارسیؓ کو آپ نے حضرت ابو الدرداءؓ کا بھائی بنایا۔ سلمان فارسیؓ مہاجر تھے اور ابو الدرداءؓ انصاری تھے۔ اس وقت مواخات کی قانونی حیثیت تھی جس کے تحت بھائی

بھائی بننے والے وراثت میں بھی حقدار ہوتے تھے اور دیگر کئی حقوق میں بھی حصہ دار ہوتے تھے۔ بعد میں جب وراثت کے مستقل احکامات آئے تو مواخات کی قانونی حیثیت ختم ہوگئی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان دونوں کو بھائی بھائی بنا دیا تو ابوالدرداءؓ سلمان فارسیؓ کو اپنے ساتھ لے کر گھر گئے۔ سلمان فارسیؓ تو پرانے آدمی تھے۔ حافظ ابن حجرؒ، حافظ ذہبیؒ کے حوالے سے ان کی کم سے کم عمر اڑھائی سو سال بتلاتے ہیں۔ (الاصابہ، ترجمہ رقم: ۳۳۵۸) کچھ روایات ساڑھے چار سو سال اور پانچ سو سال کی بھی ہیں۔ جب یہ مسلمان ہوئے تو محتاط روایت کے مطابق تقریباً دو سو سال کی عمر کے تھے۔ سرد و گرم چشیدہ، جہاں دیدہ تھے۔ مختلف مذاہب کو بھگتے ہوئے تھے، مختلف خاندان بھگتے ہوئے تھے، مختلف علاقے دیکھے ہوئے تھے۔ تجربہ کار اور پرانے بزرگ تھے۔

ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ سلمان فارسیؓ جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ گھر میں گھر والی کوئی بات نہیں ہے۔ ام الدرداءؓ کو دیکھا کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، گھر کی کوئی صفائی نہیں ہے، کوئی ساتھ رہنے والا ماحول نہیں ہے۔ حالانکہ عورت گھر میں ہو تو گھر کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھر میں عورت رہتی ہے۔ وہ مکان کو صاف رکھے گی، پردے لٹکائے گی، زیب و زینت کا اہتمام کرے گی۔ یہ عورت کی فطرت ہے، عورت کا مزاج ہے کہ وہ خود بھی بنے سنورے گی اور گھر کو بھی بنائے سنوارے گی۔ سلمان فارسیؓ نے جب دیکھا کہ گھر میں تو کوئی گھر کی بات نہیں ہے تو آتے ہی ام الدرداءؓ سے پوچھ لیا کہ یہ اپنا اور اس گھر کا کیا حال بنا رکھا ہے؟ آتے ہی انٹرویو کر لیا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ ام الدرداءؓ نے جواب دیا کہ بھائی جان، آپ کے بھائی کو کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔ عورت بنتی سنورتی ہے، لیکن کسی کے لیے بنتی سنورتی ہے؟ یہ عورت کا مزاج بھی ہے اور اس کا حق بھی ہے، لیکن وہ بنتی سنورتی کسی کے لیے ہے۔ ام الدرداء نے جواب دیا کہ جس کے لیے بننا سنورنا ہے اور اس گھر کی دیکھ بھال رکھنی ہے، اسی کو دلچسپی نہیں ہے تو میں کیا کروں؟ بس ٹھیک ہے، یہ بھی گزارا کر رہا ہے، میں بھی گزارا کر رہی ہوں۔ کہا کہ آپ کے بھائی کو کوئی حاجت نہیں کہ میں زیب و زینت کیے ہوئے ہوں یا اس گھر کی آرائش کر کے رکھوں۔

یہ پہلی بات تھی جو سلمان فارسیؓ نے اس گھر میں نوٹ کی۔ دوپہر کا وقت ہوا تو ابوالدرداءؓ نے

اپنے بھائی سلمان فارسیؓ کے لیے دستر خوان بچھایا اور کھانا رکھا، لیکن خود وہ روزے سے تھے۔ حضرت ابوالدرداءؓ بلا ناغہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ وہ دن کو روزہ رکھتے تھے اور ساری رات قیام کرتے تھے۔ خود ہی سوچیے کہ پھر بیوی کس کے لیے بنتی سنورتی! مہمان کے سامنے کھانا رکھا، لیکن خود روزے سے تھے۔ سلمان فارسیؓ نے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ جواب دیا کہ میرا تو روزہ ہے۔ اب حضورؐ نے سلمان فارسیؓ کو ابوالدرداءؓ کا صرف بھائی ہی نہیں بلکہ بڑا بھائی بنایا تھا۔ بڑے بھائی کا دبکا تو آپ کے علم میں ہے۔ فارسی کا ایک مشہور محاورہ ہے: سگ باش، برادر خورد مباش۔ مطلب یہ کہ چھوٹا بھائی کسی کا نہ بنتا۔ چھوٹا بھائی ساری زندگی مصیبت میں رہتا ہے۔ لیکن یہ کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے، یہ تو اللہ کی تقسیم ہوتی ہے کہ پہلے کس کو دنیا میں بھیجے، بعد میں کس کو بھیجے۔ تو سلمان فارسیؓ بڑے بھائی تھے۔ کہا کہ بھائی! بیٹھو اور بیٹھ کر میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ جواب دیا کہ جی میرا تو روزہ ہے۔ سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے، یہ کھانا اٹھا لو۔ میں بھی نہیں کھاتا۔ اب ابوالدرداءؓ مہمان کے سامنے سے کھانا کیسے اٹھائیں؟ چنانچہ ابوالدرداءؓ کو روزہ توڑنا پڑا اور وہ سلمان فارسیؓ کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئے۔

مسئلہ بھی یہی ہے۔ یاد رکھیں کہ ہماری اسلامی تعلیمات کا یہ اصول ہے کہ فرائض میں حقوق اللہ مقدم ہیں اور فرائض کے علاوہ نوافل، مستحبات اور مباحات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ یعنی فرائض اور واجبات میں حقوق اللہ مقدم ہیں، لیکن باقی سب معاملات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ فقہا یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ مہمان کے اکرام کے لیے اگر اس کا اصرار ہو تو آپ نفلی روزہ توڑ دیں گے، مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں گے اور بعد میں اس روزہ کی قضا کریں گے۔ چنانچہ ابوالدرداءؓ نے روزہ توڑ دیا اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ رات ہوئی تو عشا پڑھی، بستر بچھایا۔ ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ بھائی جان، آپ تو آرام فرمائیں۔ پوچھا تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہا، میں تو رات کو قیام کرتا ہوں۔ سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ بھئی، اپنا بستر لاؤ۔ ابوالدرداءؓ کہنے لگے کہ جی میں نے تو اپنے نوافل پڑھنے ہیں۔ سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ نہیں بھئی، اپنا بستر لاؤ اور سو جاؤ۔ ابوالدرداءؓ خود کہتے ہیں کہ میں یہ سوچ کر لیٹ گیا کہ جب سلمان فارسیؓ سو جائیں گے تو میں اٹھ کر اپنا کام کروں

گا۔ سلمان فارسیؓ بھی سوئے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ابو الدرداءؓ اٹھے تو سلمان فارسیؓ نے پوچھا، کدھر جا رہے ہو؟ آرام سے سو جاؤ۔ اب ابو الدرداءؓ سو گئے۔

جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو تہجد کے وقت سلمان فارسیؓ خود بھی اٹھے اور ابو الدرداءؓ کو بھی اٹھایا کہ اٹھو بھئی، اب نماز کا وقت ہے۔ تم بھی پڑھو اور میں بھی پڑھتا ہوں۔ دونوں تہجد پڑھ کر فارغ ہوئے تو فیصلہ کیا کہ چلو فجر کی نماز مسجد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے ہیں، لیکن جاتے ہوئے سلمان فارسیؓ نے ایک جملہ کہا۔ بس یہ جملہ ہمارے حقوق کے تصور کی بنیاد ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں یہ سارا پس منظر اس لیے بیان کیا ہے کہ آپ کو یہ جملہ سمجھ میں آ جائے۔ ہماری اسلامی تعلیمات میں حقوق کے تصور کی بنیاد سلمان فارسیؓ کا یہ جملہ ہے۔ فرمایا:

ان لربك عليك حقاً، ولنفسك عليك حقاً، ولأهلك عليك حقاً،

(وفي رواية: ولزورك عليك حقاً)، فأعط كل ذي حق حقه۔

(بخاری، رقم ۱۹۶۸)

''تیرے رب کے بھی تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔''

تو اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے؟ اعط كل ذي حق حقه کہ ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ اللہ کا حق اللہ کے وقت میں، بیوی کا حق بیوی کے وقت میں، آنکھوں کا حق آنکھوں کے وقت میں، مہمان کا حق مہمان کے وقت میں اور اسی طرح باقی لوگوں کے حقوق ان کے مطابق۔ سلمان فارسیؓ نے یہ کہا اور پھر دونوں مسجد کی طرف چل نکلے۔ مسجد پہنچ کر نماز پڑھی۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھئی، تمہارا کیا حال ہے، تمہارا کیا حال ہے؟ ابو الدرداءؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے آپؐ نے پوچھا کہ ہاں بھئی، تم نے اپنے بھائی کو کیسا پایا؟ ابو الدرداءؓ تو بھرے بیٹھے تھے، ساری کارگزاری سنا دی کہ یا رسول اللہؐ! میرا روزہ بھی تڑوا دیا، بیوی سے بھی انٹرویو کرتے رہے، رات کو نفل بھی نہیں پڑھنے دیے اور اب آتے وقت یہ نصیحت کر کے آ گئے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

جملہ فرمایا: صدق سلمان، سلمان نے جو کہا، سچ کہا۔

خدا فراموشی اور رہبانیت: دو انتہائیں

میں نے عرض کیا کہ حقوق کے اسلامی تصور میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ہیں۔ اسلام ان دونوں کو الگ الگ نہیں کرتا، بلکہ ان دونوں میں ترجیح و تقدیم بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ فرائض و واجبات میں ترجیح و تقدیم حقوق اللہ کی ہے اور نوافل، مستحبات اور مباحات میں ترجیح حقوق العباد کی ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا ایک تنازعہ تو یہ ہے کہ مغرب حقوق اللہ کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ ان کے ہاں اللہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں پتہ نہیں اللہ ہے بھی یا نہیں۔ مغرب میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد خدا پر یقین نہیں رکھتی۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سرزمین عرب میں دو انتہائیں تھیں۔ ایک طرف رہبانیت کے نام پر حقوق اللہ کا یہ تصور تھا کہ دنیا ہی چھوڑ دی جائے۔ رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اکیلے زندگی گزارو اور بس۔ یہ حقوق اللہ کا غلبہ تھا کہ بس اللہ کی بندگی کرو، ذکر اذکار کرو، بیوی بچوں وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید ۵۷:۲۷)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں واضح طور پر رہبانیت کے تصور کی نفی فرمائی ہے۔ احادیث میں آپ کو اس سلسلے میں بہت سے واقعات ملیں گے۔ میں اس وقت صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کروں گا۔

عبد اللہ ابن عمرؓ راوی ہیں۔ ایک موقع پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ نے، جن میں عبد اللہ ابن عمرؓ بھی تھے، آپس میں مشورہ کیا کہ حضورؐ کے گھر کے باہر کے معمولات تو ہمارے علم میں ہیں۔ آپ نماز پڑھتے ہیں، وعظ فرماتے ہیں اور جہاد پر جاتے ہیں، لیکن چار

دیواری کے اندر کے معمولات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ مشورہ کیا کہ ہمیں یہ بھی معلوم کرنے چاہئیں اور پھر ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ ان کا تصور شاید یہ تھا کہ حضور گھر میں داخل ہو کر مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہوں گے اور پھر وہیں سے باہر آ جاتے ہوں گے۔ انہوں نے طے کیا کہ ازواج مطہراتؓ سے حضورؐ کے گھر کے اندر کے معمولات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ حضورؐ کے ایک گھر کے باہر کھڑے ہو کر ام المؤمنین سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضورؐ کے گھر کے معمولات وہی ہوتے ہیں جو عام طور پر دوسرے مردوں کے ہوتے ہیں۔ ہمارا حال احوال پوچھتے ہیں، گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے ہیں، سودا سلف بھی خرید کر لاتے ہیں، آرام بھی کرتے ہیں، میاں بیوی کے حقوق کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور رات کے وقت نماز بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ: کأنهم تقالوها۔ ان حضرات نے ان معمولات کو اپنے تصور سے بہت کم سمجھا کہ ہم تو کچھ اور سمجھتے تھے، حضورؐ تو گھر کے اندر بالکل عام زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے خود ہی اس کی توجیہ بھی کر لی کہ حضورؐ کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے، اللہ نے ویسے ہی آپ کی مغفرت کا اعلان فرما رکھا ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً (الفتح ۴۸:۲)

سوچا کہ ہم تو بہرحال امتی ہیں، ہمیں تو ضرورت ہے۔ چنانچہ آپس میں بیٹھ کر اپنے معمولات طے کر لیے۔ ایک نے کہا کہ میں ساری عمر روزے رکھوں گا۔ ایک نے فیصلہ کر لیا کہ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ ایک نے طے کر لیا کہ ساری زندگی رات کے وقت قیام کروں گا، سوؤں گا نہیں۔ ان حضرات نے آپس میں عبادت کے نقطہ نظر سے یہ باتیں طے کر لیں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا۔ آپؐ نے انہیں بلا لیا۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ ہمیں شاباش ملے گی کہ ہم نے اتنا اچھا کام کیا، لیکن جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے برعکس یہ فرمایا کہ: انی لاخشاکم للہ واتقاکم له۔ میں تم سب سے زیادہ خوف خدا رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں۔ اس کا دوسرے لفظوں میں معنیٰ کیا جائے تو

مطلب یہ بنتا ہے کہ کیا ایسا کرنے سے تم لوگ مجھ سے زیادہ متقی ہو جاؤ گے؟ مجھ سے زیادہ خدا خوفی آ جائے گی تم لوگوں میں؟ انی لاخشاکم للّٰہ واتقاکم لہ۔ میں تم سے زیادہ خوف خدا رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں۔ بھئی، میں نے شادی بھی کی ہے، بلکہ شادیاں کی ہیں۔ حضور کی شادیاں تو ایک مستقل موضوع ہے۔ لوگ اس پر بہت اعتراض کرتے ہیں۔ خیر، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ فرمایا کہ میرے بچے بھی ہیں، کھاتا بھی ہوں، سوتا بھی ہوں، بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، کبھی روزہ رکھتا ہوں، کبھی نہیں رکھتا۔ بھئی میں تو سارے کام کرتا ہوں، کوئی بھی ضروری کام ترک نہیں کرتا۔ یہ فرما کر حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا: فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ (بخاری، رقم ۵۰۶۳) اس جملے کا پس منظر یہ سارا واقعہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم رکھنا میری سنت ہے، جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

عبادت اور حقوقِ انسانی میں توازن

دوسرا واقعہ عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کا ہے۔ وہ خود واقعہ سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے والد صاحب نے میری شادی کر دی اور الگ مکان دے دیا کہ جاؤ، وہاں جا کر رہو۔ عمرو ابن العاصؓ بہت ذہین آدمی تھے۔ دُھاۃِ عرب میں سے تھے۔ جرنیل بھی تھے اور عرب دنیا کے چوٹی کے تین چار ڈپلومیٹس میں سے تھے۔ والد صاحب دو چار دن کے بعد آئے کہ بیٹے کا حال احوال پوچھوں۔ بیٹا گھر پر نہیں تھا، بہو تھی۔ پوچھا بیٹی کیا حال ہے؟ کہا، ٹھیک ہے۔ خاوند کیسا ہے؟ کہا، بہت نیک ہے۔ پوچھا، تم خوش ہو؟ کہا، جی خوش ہوں۔ آپ کا بیٹا بہت اچھا ہے، ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔ خاوند کی یہ تعریف اس کی بیوی کر رہی ہے۔ لم یفتش لنا کنفا ولم یعرف لنا فراشا۔ ہمارے لیے اس نے ابھی تک کوئی کونہ تلاش نہیں کیا۔ بس اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ عمرو ابن العاصؓ سمجھ گئے کہ یہ تعریف نہیں، بلکہ شکایت ہے۔ عمرو ابن العاصؓ اپنے بیٹے کا مزاج سمجھتے تھے، چنانچہ خود اس سے بات کرنے کی بجائے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کیا کہ یارسول اللہ! میں نے عبداللہ کی شادی کی ہے اور وہ ساری رات نفلوں میں ہی لگا رہتا ہے۔

حضورؐ نے بلا لیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور نے بلوا لیا اور ایک روایت میں ہے کہ خود حضورؐ میرے گھر تشریف لے آئے۔ عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے پوچھا، ہاں بھئی! کتنی عبادت کرتے ہو؟ کہا کہ ساری رات۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں بھئی، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ فرمایا: ثلث لیل، زیادہ سے زیادہ رات کا تیسرا حصہ۔ بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، جسم کا بھی حق ہے۔ پھر پوچھا، تمہارے روزوں کی کیا ترتیب ہے؟ کہا، یارسول اللہ! مسلسل روزے رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، بس مہینے میں تین روزے کافی ہیں۔ عبداللہؓ کہتے ہیں، یارسول اللہ! تین تو تھوڑے ہیں۔ فرمایا، سات کرلو۔ عبداللہ نے کہا، یہ بھی تھوڑے ہیں۔ فرمایا، پھر دس کرلو۔ کہا، یہ بھی تھوڑے ہیں۔ فرمایا، اچھا پندرہ کرلو۔ لا صیام افضل من صوم داؤد۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے سے فضل کوئی روزہ نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام کا معمول یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن عمروؓ سے پوچھا، تمہارا قرآن کریم کا معمول کیا ہے؟ کہا، یارسول اللہ! روزانہ مکمل قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ فرمایا، مہینے میں پورا پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ تو بہت کم ہے۔ فرمایا، اچھا پندرہ دن میں پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ بھی تھوڑا ہے۔ فرمایا، اچھا دس دن میں پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ بھی کم ہے۔ فرمایا، اچھا سات دن میں پڑھ لیا کرو۔ اس سے زیادہ نہیں۔

عبداللہ ابن عمروؓ حضورؐ کے وصال کے بعد کافی عرصہ حیات رہے ہیں۔ اپنے بڑھاپے میں کہتے ہیں کہ میں اس وقت جوانی کے جوش میں تھا اور یہ اصرار میرا تھا کہ پندرہ روزے مہینے میں رکھوں گا اور قرآن کریم سات دنوں میں پڑھوں گا۔ عبداللہؓ خود کہتے ہیں کہ اس وقت تو جوانی کے جوش میں، میں نے یہ ساری باتیں کرلیں۔ اب بوڑھا ہوگیا ہوں تو خیال آتا ہے کہ :یلیتنی قبلت رخصة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کاش میں نے حضورؐ کی دی ہوئی رخصت قبول کرلی ہوتی۔ اب چونکہ یہ بات میں نے حضورؐ کے ساتھ کی تھی، اس لیے اب پوری

کرنی پڑ رہی ہے، لیکن اب میری ہمت اور طاقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ حضورؐ کی تجویز کہ مہینے میں ایک قرآن پڑھ لو اور مہینے میں تین روزے رکھ لو، میں نے قبول کر لی ہوتی تو اچھا تھا۔ (مذکورہ واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مسند احمد، تحقیق: احمد شاکر، رقم ۶۴۷۷۔ صحیح بخاری، رقم ۱۹۷۵)

انسانی حقوق اور شریعت میں فرق

میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں، اسے بطور اصول کے ذہن میں رکھیں۔ انسان جب بھی اپنے بارے میں فیصلہ کرتا ہے، وقتی حالات کے تحت کرتا ہے۔ وہ انسان ایک آدمی ہو، پارٹی ہو، پارلیمنٹ ہو یا سوسائٹی ہو، انسان اپنا فیصلہ معروضی حالات کے تحت کرتا ہے۔ پارلیمنٹ بھی کوئی فیصلہ کرے گی تو معروضی حالات کے مطابق کرے گی اور سوسائٹی بھی اگر کوئی فیصلہ کرتی ہے تو معروضی حالات کے مطابق کرتی ہے۔ جبکہ شریعت انسان کے معروضی حالات اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ اللہ کو تو پتہ ہے کہ آگے کیا ہونا ہے۔ ایک آدمی نے بوڑھا بھی ہونا ہے۔ ابھی تو یہ تیس سال کا جوان ہے، سب کچھ کر لے گا۔ جب یہ اسی (۸۰) سال کا ہوگا تو پھر کیا کرے گا؟ شریعت جب بھی فیصلہ کرتی ہے تو حال اور مستقبل دونوں کے حالات کو سامنے رکھ کر کرتی ہے۔ اس لیے شریعت کا ضابطہ ہی مقدم ہے۔ سمجھ میں آئے، تب بھی مقدم ہے۔ نہ سمجھ میں آئے، تب بھی مقدم ہے۔ بسا اوقات شریعت کا ضابطہ ذرا دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ عبد اللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تلقین فرمائی کہ نہیں بھئی، اتنی سختی ٹھیک نہیں ہے۔ بیوی کا بھی حق ہے، بچوں کا بھی حق ہے، گھر کا بھی حق ہے، جسم کا بھی حق ہے۔

یہ دو واقعات ذکر کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ حضورؐ نے سوسائٹی میں حقوق کے حوالے سے توازن قائم کیا ہے۔ ایک طرف حقوق اللہ کی بات تھی اور رہبانیت تھی۔ بس اللہ کی بندگی کرنی ہے اور دنیا وما فیہا کو چھوڑ دینا ہے۔ حضورؐ نے اس کی نفی کی ہے۔ دوسری طرف کیا تھا؟ كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (الحشر ۵۹:۱۹) خدا کو بھول گئے کہ خدا بھی ہے، اس کا بھی کوئی حق ہمارے ذمے ہے۔ یہ ایک دوسری انتہا تھی۔ اس وقت کے جاہلیت کے زمانے میں بھی تھی اور آج کے جاہلیت کے زمانے میں بھی ہے۔ آج بھی اسی جاہلیت سے ہمارا سامنا ہے کہ اس سے

خدا کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ آپس کے حقوق ادا نہیں کریں گے تو ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے، لیکن خدا کے حق ادا نہیں کریں گے تو اس سے خدا کو تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَآئِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (الانعام ۶:۱۳۶) یعنی خدا کا حق دوسروں کی طرف چلا بھی جائے تو کیا ہے۔ وہ تو غنی ہے، لیکن وہ دوسروں کا حق خدا کی طرف نہیں جانے دیتے تھے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا توازن قائم کیا اور یہ بتایا کہ حقوق اللہ کی بنیاد پر حقوق العباد کی نفی نہیں ہوگی اور حقوق العباد کی بنیاد پر حقوق اللہ کی نفی نہیں ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم نے جہاں حقوق کا تذکرہ کیا ہے، ان دونوں حقوق کا کیا ہے۔ آپ نے حقوق کا توازن قائم کیا اور بتایا کہ اس کا نام اسلام ہے۔ تو مغرب کے حقوق کے فلسفے میں اور ہمارے حقوق کے فلسفے میں ایک بنیادی فرق تو یہ ہے۔

مغربی فلسفہ کی فکری بنیاد

دوسرا فرق مغرب کے فلسفے میں اور اسلام کے فلسفے میں یہ ہے کہ مغرب جو کچھ بھی طے کرتا ہے، سوسائٹی کے حوالے سے طے کرتا ہے اور اسلام جو بھی طے کرتا ہے، وحی کے حوالے سے طے کرتا ہے۔ ہماری بنیاد وحی پر ہے اور مغرب کی بنیاد سوسائٹی پر ہے۔ یہ دونوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اسلام اور مغرب کے سارے جھگڑے کی بنیاد تقریباً یہی ہے۔ اس پر میں ایک مثال عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ بھی ہمارا ایک مستقل جھگڑا ہے کہ معاملات کس بنیاد پر طے کریں گے۔ سوسائٹی کی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر یا جو وحی کہے گی، اس کی بنیاد پر۔ ہماری بنیاد تو اس پر ہے کہ:

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (المائدہ ۵:۴۹)

لوگوں کے درمیان معاملات بما انزل اللّٰہ کی بنیاد پر طے کریں اور سوسائٹی کیا چاہتی ہے، اس کی پیروی نہ کریں۔ ایک فرق میں ذرا واضح کر دوں کہ لا تتبع اھواء ھم کی بھی حد

ہے۔ کیا سوسائٹی کی ہر خواہش کی ہم نفی کر دیں گے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ لا تتبع اهواء هم کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن نے سوسائٹی کی ہر خواہش کی نفی کر دی ہے۔ سوسائٹی کی اکثریت کی ہر خواہش رد ہو جائے، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کی جو خواہش حق کے مقابلے پر ہو گی، وہ رد کر دی جائے گی۔ لَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ:۴۸) فقہی اصطلاح میں ہم یوں کہتے ہیں کہ منصوصات کے مقابلے میں سوسائٹی کی خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہاں اگر منصوصات کے خلاف کوئی خواہش نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سوسائٹی کی کوئی بات ماننی ہی نہیں۔ بدقسمتی سے ہم بھی اس معاملے میں دوسری انتہا پر چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے خود یہ حد بیان کر دی کہ آپ کے پاس جو وحی آ گئی، جو نصوص قطعیہ آ گئیں، ان معاملات میں سوسائٹی کی خواہشات کی پیروی نہیں ہو گی۔ اگر سوسائٹی قرآن وسنت کے کسی فیصلہ کے مقابلے پر آتی ہے تو اس کی بات رد ہو جائے گی، باقی جو معاملات ہیں ان میں سوسائٹی کا حق ہے، وہ جیسے چاہے کرے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے ڈنمارک سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت پر مشتمل خاکے چھپے تھے۔ اس پر دنیا میں ایک لمبی بحث چلی تھی۔ اس مباحثے میں مغربی دانش وروں نے بہت کچھ لکھا۔ میں اس بحث کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جس جریدہ نے یہ کارٹون چھاپے تھے، اس کے ایڈیٹر فلیمنگ روز نے اپنی وضاحت میں بہت کچھ لکھا کہ میں نے ٹھیک کیا ہے اور آئندہ بھی کروں گا اور پھر دوبارہ بھی اس نے یہ کیا۔ اس موقع پر ایک مغربی دانش ور نے لکھا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں دو بنیادی فرق ہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی بالغ ہو گئی ہے۔ مغرب والے کہتے ہیں کہ نابالغ بچے کو باپ کی انگلی پکڑنے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ بالغ بچے کو نہیں۔ جب سوسائٹی نابالغ تھی، تب ہم آسمانی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے۔ اب سوسائٹی بالغ اور عقل مند ہو گئی ہے، اب یہ خود فیصلے کرے گی۔ اسے کسی کی ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ مغرب کہتا ہے کہ ہم نے آزاد ذہن سے فیصلے کرنے شروع کر دیے ہیں، ہم نے خدا، رسول اور بائبل کا حوالہ ذہنوں سے اتار دیا ہے۔ ہم کوئی قانون بناتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے، کوئی فیصلہ کرتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ Jesus (عیسیٰ) نے اس بارے میں کیا کہا۔ ہم

کوئی ضابطہ بناتے وقت بائبل سے نہیں پوچھتے کہ بائبل اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ ہم نے یہ حوالے چھوڑ دیے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور قرآن کا حوالہ اپنے ذہنوں سے چمٹایا ہوا ہے۔ ان سے جب بات کرو، کہتے ہیں کہ خدا نے یہ کہا ہے۔ کسی مسئلے پر بحث کرو، کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ لکھا ہے۔ کسی عنوان پر بات کرو تو کہتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ کہا ہے۔ یہ مغربی دانش ور کہتا ہے کہ بھئی چھوڑو اس قصے کو۔ آزاد ذہن سے فیصلے کرو۔

آپ حضرات یہ بات پوری طرح سے سمجھ لیں، کیونکہ یہی اصل جھگڑے کی بنیاد ہے۔ اس مغربی دانش ور کی یہ بات ٹھیک ہے اور ہم اس پر الحمد للہ ثم الحمد للہ کہتے ہیں، کیونکہ مسلم سوسائٹی کی تمام تر خرابیوں کے باوجود آج بھی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے ذہنوں میں خدا اور رسول کا حوالہ قائم ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر کسی کو قرآن کے خلاف بھی بات کرنی ہے تو حوالہ کہاں سے ڈھونڈ کر لائے گا؟ قرآن سے ہی لائے گا۔ سنت کے خلاف کوئی بات کرے گا تو حوالہ کس کا دے گا؟ سنت کا ہی دے گا۔ آج بھی مسلم معاشرے میں قرآن وسنت کے حوالے سے ہٹ کر کوئی بات کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی سننے کو تیار نہیں ہے۔ مسلم معاشرے میں اگر کسی نے کوئی بات کرنی ہے تو اسے قرآن سے کوئی آیت تلاش کرنی پڑے گی یا حدیث کا کوئی ٹکڑا ڈھونڈ کر لانا پڑے گا۔ ہمارے ہاں بڑی خرابیاں ہیں، بڑی کوتاہیاں ہیں، بڑی بدعملی ہے، لیکن الحمد للہ آج بھی ہمارے ہاں یہ حوالہ قائم ہے، جبکہ مغرب کے لیے یہی حوالہ پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

میں مغرب والوں سے تحدی کے طور پر دو باتیں کہا کرتا ہوں۔ میں مثال دے کر یہ واضح کروں گا۔ میں مغرب والوں سے کہتا ہوں کہ دنیا میں کہیں بھی، کسی کونے میں، راستے میں چلتے ہوئے کسی مسلمان کو روک لو اور اس سے ایک سوال کرو کہ قرآن کریم نے یہ بات کہی ہے جبکہ آج کی سائنس اور فلسفہ، آج کی اقوام متحدہ یا آج کی سوسائٹی یہ بات کہتی ہے، تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ حضرات کے خیال میں اس مسلمان کا جواب کیا ہوگا؟ وہ مسلمان دوٹوک جواب دے گا کہ قرآن کی بات ٹھیک ہے، چاہے اسے مسئلے اور دلائل کا کچھ پتہ نہ ہو۔ اسی طرح دنیا کے کسی مسلمان سے کہو کہ محمد رسول اللہؐ نے یہ بات (نعوذ باللہ) غلط کہی تھی، آپ کے خیال

میں وہ مسلمان اس سے متفق ہو جائے گا؟ ایک عالم تو دلیل کے ساتھ بات کر لے گا، لیکن ایک عام آدمی بھی اس بات سے متفق نہیں ہوگا، چاہے اس کے پاس دلیل ہو یا نہ ہو۔ مغرب اسے کمٹمنٹ کا نام دیتا ہے، جبکہ ہم اسے عقیدہ کہتے ہیں۔ ہماری آج کی اس پوزیشن نے مغرب کو پاگل کر رکھا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان قرآن کریم کی یا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا۔

ایک مغربی دانشور یہ بھی کہتا ہے کہ یہ مسلمان عجیب لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں مغرب میں آ کر رہتے ہیں، شراب پیتے ہیں، حرام کاریاں کرتے ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، لیکن جونہی ان میں سے کسی کے سامنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لیں تو وہ بالکل بدل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم میں اور مسلمانوں میں ایک فرق یہ ہے کہ ہمیں ایسی کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ ہمارے سامنے کوئی Jesus (عیسیٰ علیہ السلام) کی توہین کرے تو کوئی غصہ نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات ہم اسے انجوائے کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کو ایسی ہر بات پر غصہ آ جاتا ہے۔ یہ جذباتی قوم ہے۔

آسمانی تعلیمات سے انحراف

میں نے بھی ان مغربی دانشوروں کے جواب میں دو چار باتیں لکھیں جو میں یہاں دہرا دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں پر غصہ آتا ہے جبکہ ہم یہ سوچ کر کہ یہ اس بندے کا آزادیٔ رائے کا حق ہے، اس بات کو انجوائے کرتے ہیں کہ کوئی بائبل کی غلطی نکالے، Jesus (عیسیٰ علیہ السلام) کی توہین کرے۔ میں نے اسے کہا کہ بھئی زندہ کنکشن اور مردہ کنکشن میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سگنل اگر موجود ہیں تو فون سیٹ کچھ نہ کچھ تو کام کرے گا اور اگر سگنل ہی موجود نہ ہوں، کنکشن ہی ڈیڈ ہو تو وہاں جدید ترین فون سیٹ بھی کیا کام کرے گا؟ وہ سیٹ پھر اپنے آپ ہی انجوائے کرے گا، اور تو وہ کسی کام کا نہیں۔ ہم مسلمانوں کی خرابیاں فون سیٹ کی خرابیاں ہیں، کنکشن ہمارا آج بھی قائم ہے۔ قرآن کے ساتھ بھی قائم ہے اور رسول کے ساتھ بھی قائم ہے۔ اس کنکشن کی لمٹ قیامت تک ہے۔ اس کا بیلنس ختم نہیں ہوتا۔ ہماری خرابیاں فون سیٹ میں ہیں۔ اللہ کرے، ہمارے سیٹ ٹھیک ہو جائیں۔ جبکہ تمہارا تو سوئچ ہی آف ہے، تم نے کیا

غصہ کرتا ہے؟

ایک مغربی دانش ور نے کہا کہ ہم نے خدا، رسول کا حوالہ چھوڑ دیا ہے، مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول کا حوالہ ذہن پر مسلط کر رکھا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ بات سنو، ہم پر کس بات کا رعب جماتے ہو کہ ہم نے حوالہ چھوڑ دیا۔ تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے؟ تورات اپنی اصل اور خالص شکل میں دنیا میں کہیں ہے؟ انجیل کہیں دنیا میں ہے؟ زبور کہیں ہے؟ ہمارے پاس تو قرآن ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ دنیا کا کوئی یہودی تورات کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ یہ وہ تورات ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، دنیا کا کوئی یہودی یہ حوصلہ نہیں کرے گا۔ میں جذبات کی بات نہیں کر رہا، حقائق کی بات کر رہا ہوں۔ دنیا کا کوئی عیسائی انجیل کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات نہیں کر سکتا کہ یہ وہ انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن دنیا کا ہر مسلمان دنیا کے کسی بھی حصے میں، قرآن کریم کے کسی بھی نسخے پر ہاتھ رکھ کر بڑے حوصلے سے یہ بات کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

آج سے کوئی بارہ چودہ سال پہلے کی بات ہے، کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بائبل پر پندرہ دن مسلسل ایک سیمینار ہوا۔ دنیا سے بائبل کے چوٹی کے ایک سو ماہرین جمع ہوئے اور پندرہ دن یہ طے کرنے کے لیے بیٹھے رہے کہ اناجیل اربعہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کتنی ہیں۔ بائبل کے دو حصے ہیں: عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید (Old Testament & New Testament)۔ عہد نامہ قدیم میں تورات، زبور اور ان سے متعلقہ رسالے ہیں جبکہ عہد نامہ جدید میں اناجیل اور ان سے متعلقہ رسائل ہیں۔ یہ ماہرین یہ طے کرنے بیٹھے کہ ان اناجیل میں الحاقی تعلیمات کتنی ہیں اور اصل کتنی ہیں۔ پندرہ دن کے غور و خوض کے بعد انہوں نے جو فیصلہ دیا، وہ دنیا کے بڑے میگزینز میں چھپا اور باقاعدہ ریکارڈ پر ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ اناجیل میں پندرہ فیصد آیات ایسی ہیں جن کے بارے میں ظن غالب کے درجے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات ہیں، باقی سب الحاقی ہیں۔ یہ فیصلہ میرا نہیں ہے۔ امریکہ کے

ریاست کیلی فورنیا میں دنیا بھر سے اکٹھے ہونے والے بائبل کے ایک سو ماہرین کا یہ فیصلہ ہے۔

دوسرا حوالہ پاکستان کا ہے۔ ہمارے شہر گوجرانوالہ میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ وہاں سے ان کا ایک اردو ماہنامہ رسالہ نکلتا ہے ''کلامِ حق''۔ یہ رسالہ تقریباً بیس سال سے میری نظر میں ہے۔ گزشتہ سال ''کلامِ حق'' نے ایک مضمون چھاپا جس میں اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ لاہور سے چھپنے والی انگلش بائبل میں اکتالیس آیات بدل دی گئی ہیں۔ مضمون نگار نے باقاعدہ حوالے دیے کہ پچھلے ایڈیشن میں یہ آیت یوں تھی اور اس نئے ایڈیشن میں یہ آیت یوں ہے۔ پچھلے ایڈیشن میں یہ جملہ نہیں تھا، جبکہ اس نئے چھپنے والے ایڈیشن میں یہ نیا جملہ موجود ہے۔ پچھلے ایڈیشن میں فلاں جملہ تھا، لیکن نئے ایڈیشن سے غائب ہے۔ اس نے باقاعدہ یہ موازنہ کر کے بتایا۔ میں نے اس پر لکھا کہ بھئی، ایک ایڈیشن میں اس کتاب کی اکتالیس آیات بدل گئی ہیں تو دو ہزار سال میں اس کتاب کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا؟ کیونکہ اس کتاب کی عمر تو دو ہزار سال ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو قرآن اوریجنل ہے۔ یہ صرف ہمارا دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا مانتی ہے کہ یہ اوریجنل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن صحابہ کرامؓ کو دیا جنہوں نے اسے مرتب کر لیا۔ درمیان میں کوئی تیسرا واسطہ نہیں تھا۔ قرآن کے وہ چھ سات نسخے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، ان میں سے دو یا تین اصلی نسخے اس وقت بھی موجود ہیں۔ مصاحفِ عثمانی چھ یا سات تھے۔ ایک ترکی کے توپ کاپی میوزیم میں ہے، ایک تاشقند کی مرکزی جامع مسجد کے میوزیم میں ہے اور ایک لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ لندن والا نسخہ تو میں نے بھی دیکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مختلف بادشاہوں کے پاس رہا۔ صفوی بادشاہوں کے پاس، سلطان سلیم آف ترکی کے پاس رہا، جہانگیر بادشاہ اور شاہ جہان کے پاس رہا۔ کوئی چھ یا سات بادشاہوں کی مہریں اس پر لگی ہوئی ہیں اور اس کے آخر میں لکھا ہے: کتبہ عثمان ابن عفان۔ اللہ کی تکوینی حکمت دیکھیں کہ یہ نسخہ کہاں پڑا ہوا ہے؟ لندن میں۔

یمن میں مصحف علویؓ کا انکشاف

ایک دلچسپ قصہ آپ کو بتاؤں۔ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ آپ نے دیکھے ہوں گے۔

ہم نے تو خیر زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گزارا ہے، اکٹھے کام کیا ہے۔ ۱۹۸۸ء کے دوران قومی اخبارات میں ایک خبر چھپی کہ یمن میں قرآن کریم کا ایک پرانا نسخہ برآمد ہوا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میں اس زمانے میں ترجمان اسلام کا ایڈیٹر ہوتا تھا۔ مولانا دفتر میں آئے اور کہا کہ یار یہ خبر پڑھی ہے؟ میں نے کہا، جی پڑھی ہے۔ تو اپنے ہی لہجے میں کہتے ہیں کہ ''کدھائیں کوئی شرارت نا ہووے''۔ کہیں یہ کوئی شرارت نہ ہو کہ قرآن کا نسخہ وہ نہ ہو جو چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے اور یہ کہہ دیا جائے کہ حضرت علیؓ کا قرآن تو کوئی اور تھا۔ اور یہ جھگڑا تو ویسے بھی چل رہا ہے۔ مولانا کے ذوق کی داد دیجیے، اللہ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ کہنے لگے کہ ''مڑ میں ویناں''، میں بس جاتا ہوں دیکھنے کے لیے۔ اس کام کے لیے مولانا نے جیب سے خرچ کیا، یمن گئے، صنعا میں قرآن کریم کا وہ نسخہ دیکھا اور تحقیق کی۔ مولانا تو شیعہ سنی موضوع کے بہت بڑے مناظر تھے۔ شیعہ سنی جھگڑے کے سارے نکات جن پر جھگڑے تھے، ان پر قرآنی آیات خاص طور پر دیکھیں۔ ایک ہفتہ کے بعد وطن واپس تشریف لائے اور بتایا کہ میں نے ساری جگہیں دیکھی ہیں، مصحف عثمانیؓ اور مصحف علیؓ میں کوئی فرق نہیں ہے اور جرمن ماہرین نے ایک سال اس قرآن کریم کو اپنے پاس رکھ کر اس پر تحقیق کی ہے اور پھر اس پر رپورٹ دی ہے کہ یہ کاغذ بھی حضرت علی کے زمانے کا ہے اور سیاہی بھی اسی دور کی ہے اور خط بھی حضرت علیؓ کا ہی ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے۔

ایرانی مجتہد سے مولانا چنیوٹیؒ کا مکالمہ

ایک واقعہ اور بتا دیتا ہوں۔ ۱۹۸۷ء میں سنی علما کا ایک وفد ایران گیا تا کہ انقلاب ایران کے اثرات دیکھ سکے۔ اس وفد میں مولانا منظور احمد چنیوٹی تھے، حافظ حسین احمد بھی تھے، میں بھی تھا، اور بہت سے علما تھے۔ باقی تفصیلات تو چھوڑیے، بس نکتے کی بات بتاتا ہوں۔ اس زمانے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم کی کتاب ''الشیعۃ والقرآن'' منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب نے دنیا میں بڑا طوفان بپا کیا تھا کہ شیعوں کا موجودہ قرآن کریم پر ایمان نہیں ہے۔ اس موضوع پر عربی زبان میں یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس زمانے میں ایران عراق جنگ تھی۔ عراق نے تو لاکھوں کی تعداد میں

یہ کتاب تقسیم کرائی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم شاید اسی کتاب کی وجہ سے دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ خیر، ایران کے سینٹ ہال میں ہماری ایک نشست ہوئی۔ اس میں آیت اللہ خزعلی تھے۔ آیت اللہ صاحب نے وہاں ایک بچے سے قرآن کریم پڑھوایا اور اس بچے نے اچھا قرآن پڑھا۔ پھر آیت اللہ صاحب نے تقریر کی کہ ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم قرآن کریم پر ایمان نہیں رکھتے۔ ''واللہ، ما ایمان داریم''۔ پھر قرآن انہوں نے جیب سے نکالا اور کہا کہ ''ایں قرآن حق است، یک حرف کم نہ زیاد''۔ کہ خدا کی قسم! ہمارا اس قرآن پر ایمان ہے، اس کا نہ ایک حرف کم ہے نہ زیادہ اور یہ کہ لوگ خواہ مخواہ ہمارے بارے میں پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

آیت اللہ خزعلی ان کی پانچ بڑی آیتوں میں سے ہیں۔ مولانا چنیوٹی اور میں اس نشست میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑی مجلس لگی ہوئی تھی۔ مولانا مجھ سے کہتے ہیں: ''مڑ چھیڑاں اینوں میں؟'' میں اسے ذرا چھیڑوں؟ بس پھر مولانا کھڑے ہو گئے۔ مولانا تو مناظر آدمی تھے۔ کہا کہ جی، آپ نے یہ بات کی کہ قرآن کریم پر آپ کا ایمان ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ہم تو پہلی دفعہ آپ سے یہ بات سن رہے ہیں کہ نہ یک حرف کم نہ زیاد، لیکن ہمارا ایک اشکال ہے۔ اگر آپ اسے حل فرما سکیں۔ آیت اللہ صاحب فارسی میں بات کر رہے تھے جبکہ مولانا صاحب عربی میں۔ آیت اللہ صاحب نے کہا کہ جی فرمائیں۔ مولانا صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں صحاح اربعہ میں روایات ہیں کہ یہ قرآن محرف ہے، اصل نہیں ہے۔ اصل قرآن امام غائب کے پاس ہے۔ اگر آپ کے کہنے کے مطابق یہ قرآن بالکل اصل ہے، نہ یک حرف کم نہ زیاد، تو پھر ان روایات کا کیا ہوگا؟ وہ بھی عالم آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کے ہاں بھی امام سیوطی نے لکھا ہے کہ پہلے قرآن کی سترہ ہزار آیات تھیں، لیکن بعد میں چھ ہزار رہ گئیں۔ آپ قرآن کے بارے میں اپنی اس روایت کو نہیں مانتے اور ہم اپنی ان روایات کو نہیں مانتے۔

مولانا پھر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ نہیں جی، اتنا آسان نہیں ہے۔ سیوطی ہمارے ہاں پانچویں چھٹے درجے کے آدمی ہیں۔ ہم نہ بھی مانیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن آپ کے ہاں کی روایات تو صحاحِ اربعہ کی روایات ہیں۔ جیسے ہماری صحاحِ ستہ ہیں، اسی طرح شیعوں کی صحاحِ اربعہ ہیں۔

مولانا نے کہا کہ یہ صحاح اربعہ کی روایات ہیں اور کچھ کم نہیں، بلکہ دو ہزار روایات ہیں۔ ہمارے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ہم سیوطی کو نہ بھی مانیں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی روایات تو امام جعفر صادقؒ سے ہیں۔ آیت اللہ صاحب نے پھر کہا کہ امام جعفر صادقؒ ہی کا قول ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو، اسے دیوار پر دے مارو۔ بس ہم ان روایات کو دیوار پر مارتے ہیں۔ مولانا پھر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ قرآن کریم کے حوالے سے ایسی بات کر رہے ہیں۔ بس ایک بات اور ہے۔ اگر اسے آپ واضح کر دیں تو ہمارا ذہن صاف ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں مسلمات میں ہے کہ جو آدمی قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ آپ کے ہاں ایسے آدمی کی کیا حیثیت ہے؟ کیا آپ ایسے آدمی کو مسلمان سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہو؟ آیت اللہ صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ جی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آپ چائے پئیں، مجھے کہیں جانا ہے۔

خیر، بات نکلی تھی بعض مغربی دانش وروں کی اس بات سے کہ ہم نے تو خدا، رسول اور بائبل کا حوالہ چھوڑ دیا، جبکہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور قرآن کا حوالہ نہیں چھوڑا۔ اس پر میں نے ان سے کہا تھا کہ بھئی، تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے؟ جبکہ ہمارے پاس تو موجود ہے۔ قرآن کریم بھی اوریجنل ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بھی ہمارے پاس اوریجنل ہے۔ دین دو ہی باتوں کا نام ہوتا ہے، آسمان سے اترنے والی وحی اور جس نبی پر وحی اتر رہی ہے، اس کی تشریحات۔ ہماری اصطلاح میں اسے قرآن وسنت کہتے ہیں۔ قرآن بھی اصل ہے اور اس پر پیغمبر کا عمل، تشریح، ارشادات بھی اصلی حالات میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم سے جو توقع کرتا ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں گے، وہ بہت بے وقوف ہے۔ اس پر میں نے ایک لطیفہ لکھا کہ دو دوست آپس میں بیٹھ کر بات کر رہے تھے۔ ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا کہ اللہ تمہیں دو مکان دے دے تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر اللہ تمہیں دو موٹر سائیکل دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے پھر کہا کہ اگر اللہ تمہیں دو بھینسیں دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرا کہنے لگا، وہ

میرے پاس پہلے سے موجود ہیں، تم ان پر نظر مت رکھو۔

تو ہمارے پاس دونوں چیزیں اور پنجل ہیں۔ آپ حضرات تصور نہیں کر سکتے کہ ان دونوں چیزوں کے موجود ہونے سے مغرب کتنا پریشان ہے۔

دین کی حفاظت میں مدارس کا کردار

آج کل مدارس کے بارے میں کئی سطح پر کئی طرح کے اقدامات ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال واشنگٹن میں ایک دوست کے ساتھ ایک مکالمے میں، میں نے یہ کہا کہ مغرب کو مدارس کے بارے میں ایک مغالطہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت مدارس کی وجہ سے محفوظ ہیں اور یہ کہ مدارس نہیں ہوں گے تو قرآن کریم کی تعلیم بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ مدارس کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب مدارس نہیں رہیں گے تو قرآن وسنت کی تعلیم نہیں رہے گی، جب تعلیم نہیں رہے گی تو کمٹمنٹ باقی نہیں رہے گی، جب کمٹمنٹ باقی نہیں رہے گی تو ہم جو چاہیں گے کر لیں گے۔ میں نے کہا کہ ان کا یہ مغالطہ ہے۔ میں نے کہا، قرآن وسنت اس لیے موجود نہیں ہیں کہ مدارس موجود ہیں، بلکہ مدارس اس لیے موجود ہیں کہ قرآن وسنت موجود ہیں۔ قرآن وسنت کی وجہ سے مدارس موجود ہیں۔ قرآن نے تو قیامت تک رہنا ہے۔ جو اس سے وابستہ ہوگا، وہ بھی رہے گا۔ ہمارا قرآن پر کوئی احسان نہیں ہے۔ ہم اس کی حفاظت نہیں کر رہے، بلکہ قرآن ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ اگر ہمارے اندر بھی کسی کے ذہن میں یہ مغالطہ ہے تو دور کر لے کہ ہم قرآن کی حفاظت نہیں کر رہے بلکہ ہماری قرآن سے وابستگی میں ہماری حفاظت ہے۔ اللہ نے تو یہ حفاظت ہمارے ذمے لگائی ہی نہیں ہے۔ پہلی امتوں کے ذمے ان کی کتابوں کی حفاظت لگائی گئی تھی: بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۔ (المائدہ ۵: ۴۴) ہمارے بارے میں تو اللہ نے صاف کہہ دیا کہ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر ۱۵: ۹)۔

قرآن وسنت کی تعبیر نو کا مسئلہ

ضمناً ایک بات ذہن میں آ گئی کہ آج کل اس بات پر بھی زور دیا جا رہا ہے کہ قرآن اگر ختم

نہیں ہوتا تو قرآنی تعلیمات ختم کر دو۔ اصل مسئلہ تو کمٹمنٹ کا ہے کہ مسلمان کوئی دوسری بات سنتا ہی نہیں اور اس کے پیچھے وجہ قرآن و سنت کی موجودگی ہے۔ قرآن و سنت کی موجودگی کی وجہ مدارس ہیں اور مدارس کی موجودگی کی وجہ ہیں مولوی۔ تو قرآن کریم اگر تبدیل نہیں ہوتا تو کم از کم اس کی شرح تو تبدیل ہو جائے۔ قرآن و سنت کی تعبیر نو ہو جائے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال سے ہمارے دانش ور سر کھپا رہے ہیں۔ کبھی ایک حلقہ کھڑا ہوتا ہے، کبھی دوسرا حلقہ کھڑا ہوتا ہے کہ تعبیر نو کرو۔

ایک ایسے ہی دانشور سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھا یار، تم لوگ کس مصیبت میں پڑے ہوئے ہو؟ تمہارے خیال میں قرآن و سنت نئی تعبیر کو لوگ ان لیں گے؟ میں نے پوچھا کہ قرآن و سنت کس زبان میں ہیں؟ کہا، عربی میں۔ میں نے پوچھا، عربی زبان زندہ زبان ہے یا مردہ زبان؟ بائبل کا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ مردہ زبان، عبرانی میں تھی۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور عربی زبان زندہ زبان ہے۔ عربی کی لغت، محاورے، ضرب المثل، تشریحات سب موجود ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تشریح میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت دونوں موجود ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی فلاں آیت کی تشریح حضورؐ نے اس طرح کی ہے، کیا یہ ریکارڈ پر ہے یا نہیں؟ رسول اللہؐ نے فلاں آیت پر یوں عمل کیا، یہ بھی ریکارڈ پر ہے یا نہیں؟ اگر کوئی عام مسلمان یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کا ترجمہ کے اعتبار سے مفہوم کیا ہے اور نبی کریمؐ نے اس آیت کی تشریح کیسے کی ہے، کیا عام مسلمان کی اس بات تک رسائی ممکن ہے یا نہیں؟ پھر یہ کہ دنیا کا کوئی مسلمان قرآن کریم کی آیت سمجھنے کے لیے عربی زبان تک رسائی حاصل کرنا چاہے اور اس کی تشریح میں حضورؐ کی تعلیمات تک رسائی حاصل کرنا چاہے، کیا یہ ممکن ہے یا نہیں؟ تو میں نے کہا کہ ان دو باتوں کے ہوتے ہوئے کوئی دانشور یہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ اس کی اختراع کی ہوئی تشریح قبول کر لی جائے گی۔ ایک آیت کے متعلق ایک مسلمان کو پتہ چل جائے کہ حضورؐ نے اس پر یوں عمل کیا ہے تو دنیا کی کوئی دلیل، کوئی تشریح، کوئی قوت اس مسلمان کو کسی نئی تشریح پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ تو میں نے کہا کہ بھئی کیوں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہو؟ ایک حلقہ کھڑا کرتے ہو۔ دس پندرہ سال ایک شور و غل مچتا ہے، بعد میں وہ ٹھس ہو جاتا ہے۔ میں نے

کہا کہ کئی حلقے تو میرے سامنے ٹھس ہوئے ہیں۔

بات چلی تھی فلیمنگ روز کے کارٹونوں سے۔ بات چونکہ بہت زیادہ اہم تھی، اس لیے میں نے بھی اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مغربی دانش وروں نے کہا کہ مسلمانوں نے قرآن وسنت کا حوالہ باقی رکھا ہوا ہے جبکہ ہم نے رسول اور بائبل کا حوالہ چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ تمہارے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں جسے چھوڑنے کا تم احسان جتا رہے ہو۔ ہمارے پاس تو الحمد للہ قرآن بھی اپنی اصل حالت میں ہے اور اس کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیث وعمل بھی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس لیے ہم سے کوئی یہ توقع نہ کرے کہ ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ اگر کوئی یہ توقع کرتا ہے تو اس سے بڑا کوئی بے وقوف دنیا میں نہیں ہے۔

حقوق کے فلسفے میں مغرب اور ہمارے درمیان ایک فرق تو میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مغرب صرف سوسائٹی کی بات کرتا ہے، انسانوں کے حقوق کی بات کرتا ہے، جبکہ ہم بات کرتے ہیں حقوق اللہ کی اور حقوق العباد دونوں کی۔ دوسرا فرق میں نے یہ بتایا تھا کہ مغرب جب حقوق کی بات کرتا ہے تو اس کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ سوسائٹی کیا چاہتی ہے اور سوسائٹی کیا سوچتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں حقوق کی بنیاد علومِ وحی پر ہے۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔

تیسرا اہم فرق یہ ہے کہ مغرب جب حقوق کی بات کرتا ہے تو وہ فرد سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ تمہارا یہ حق ہے۔ مغرب حقوق مانگنے کا سبق دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام حقوق دینے کی بات کرتا ہے۔ اسلام فرد سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ تمہارے ذمے یہ حق ہے۔ اس بات پر ذرا غور کیجیے۔ مغرب حقوق حاصل کرنے کی بات کرتا ہے، جبکہ اسلام حقوق ادا کرنے کی بات کرتا ہے۔ دنیا کا ہر شخص اگر حق مانگنے پر آجائے تو تصور کیجیے کہ سوسائٹی کا کیا حال ہوگا؟ اس کے برعکس دنیا کا ہر شخص حق ادا کرنے پر آجائے تو سوسائٹی کی کیا صورت ہوگی؟ تو ہم مغرب سے کہتے ہیں کہ تم حق وصول کرنے کی بات کرتے ہو جبکہ ہم حق ادا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تیسرا لیکن بہت اہم فرق ہے۔

مغرب میں انسانی حقوق کا تاریخی پس منظر

اب میں مغرب کے حقوق کے فلسفے کی وضاحت کرتا ہوں، لیکن اس کے لیے اس کی کچھ تاریخ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر تو اس کا آخری مرحلہ ہے، لیکن اس سے پہلے ایک پوری تاریخ ہے جس سے گزر کر مغرب کے ہاں حقوق کا فلسفہ یہاں تک پہنچا ہے۔ مغرب جو یہ کہتا ہے کہ ہم نے انسانیت کو حقوق سے متعارف کرایا، انسانوں میں حقوق کا شعور پیدا کیا، میں اس کی تھوڑی سی تاریخ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہوں گا۔

برطانیہ انسانی حقوق کا چیمپئن ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ کا ایک بادشاہ تھا کانریڈ دوم۔ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا تصور اس نے دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں مطلق العنان بادشاہت کی بجائے ایک پارلیمنٹ اپنے اختیارات کے ساتھ گیارہویں صدی عیسوی میں متعارف ہوئی۔ پہلے اس وقت کے حکومتی نظام کا ڈھانچہ سمجھ لیں۔ تین طاقتیں حکمران تھیں: بادشاہ، جاگیردار اور پوپ۔

عیسائیوں کے تین بڑے فرقے ہیں: کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرتھوڈکس۔ کیتھولک فرقے کے سربراہ کو پاپائے روم کہتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ کے سربراہ آرچ بشپ آف کینٹربری (Archbishop Of Canterbury) ہیں اور یہ برطانیہ میں ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ صرف کیتھولک فرقہ ہی ہوتا تھا، پروٹسٹنٹ فرقہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ امریکہ والے زیادہ کیتھولک ہیں، مغربی یورپ والے زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں، جبکہ مشرقی یورپ اور روس والے زیادہ

آرتھوڈکس ہیں۔ آرتھوڈکس بہت زیادہ متشدد ہیں۔

پوپ ایک زمانے میں بہت بڑی قوت تھی۔ پوپ کو بائبل کی تشریح کا حق حاصل تھا اور آج بھی ہے۔ پوپ بائبل کی جو چاہے تشریح کرے، کسی چیز کو حلال قرار دے دے یا کسی چیز کو حرام قرار دے دے، یہ اس کا اختیار ہے۔ اس کی ایک پاپائے روم کونسل ہے۔ کونسل فیصلے کرتی ہے جبکہ پوپ اسے نافذ کرتا ہے۔ پوپ بذات خود ایک اتھارٹی ہے۔ پوپ کو یہ فائنل اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ بائبل کی تشریح میں کچھ بھی کہہ دے۔ یہی مغالطہ آج ہمارے بعض دوستوں کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ آج علماء سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اجتہاد سے کام لیں اور اجتہاد سے کام لے کر یہ مسئلہ بدل دیں، وہ مسئلہ بدل دیں۔ لوگوں کے نزدیک اسلام میں اجتہاد کا اختیار ایسا ہی ہے جیسا کہ عیسائیت میں پوپ کے پاس بائبل کی تشریح کا اختیار ہے۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بھئی تم لوگ مغالطے میں ہو۔ عیسائیت میں پوپ کو یہ اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ بائبل کی کوئی بھی تشریح کر سکتا ہے۔ اسلام میں یہ اتھارٹی کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ بات ذرا سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں یہ اتھارٹی کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن کی تشریح کی بنیاد پر کوئی بھی فیصلہ ازخود کر سکے۔

اجتہاد کی بات چل نکلی ہے تو اس حوالے سے ایک لطیفہ میرے ذہن میں آیا ہے۔ ایک دفعہ میں برطانیہ میں سفر کر رہا تھا، لندن سے مانچسٹر کی ٹرین میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نوجوان مجھے دیکھ کر قریب آ کر بیٹھ گیا اور پوچھا، آپ مولانا صاحب ہیں؟ میں نے کہا، لوگ یہی کہتے ہیں۔ کہنے لگا، آپ کو اجتہاد کا اختیار حاصل ہے؟ میں نے پوچھا، آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے جس میں آپ کو اجتہاد کی ضرورت پڑ گئی؟ اس کے نزدیک اجتہاد کا تصور یہ تھا کہ اجتہاد کسی ایسی اتھارٹی کا نام ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ اتھارٹی ہو تو اسے شرعی معاملات میں کوئی بھی فیصلہ دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور اتنے عرصے سے برطانیہ میں رہ رہا ہوں۔ میں باقاعدہ نماز پڑھتا ہوں، لیکن ظہر اور عصر میری رہ جاتی ہے، کیونکہ دفتر سے نماز کے لیے الگ چھٹی نہیں ملتی۔ چنانچہ میں ایسا کرتا ہوں کہ ظہر تو فجر کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں جبکہ عصر میں مغرب کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ اگر آپ کو اجتہاد کا اختیار ہے تو آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں۔ میں یہ

بتانا چاہ رہا ہوں کہ اجتہاد کا عام مفہوم لوگوں کے ذہن میں کچھ اس طرح سے ہے۔ میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میں نفتی نفتی کر سکتا ہوں۔ عصر کی نماز جو تم مغرب کے ساتھ پڑھتے ہو، اس کی گنجائش دے سکتا ہوں کہ مجبوری ہے۔ نماز قضا ہو جائے گی، لیکن ہو جائے گی۔ البتہ ظہر کی نماز فجر کے ساتھ پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر بہت زیادہ مجبوری ہے کہ ظہر کی نماز تم لنچ بریک میں بھی نہیں پڑھ سکتے تو پھر ظہر بھی تم مغرب کے ساتھ ہی پڑھ لیا کرو۔ میں نے سوچا کہ یہ تو غنیمت ہے کہ ایک نوجوان اتنے عرصے سے برطانیہ میں ہے اور وہ باقاعدہ نماز پڑھتا ہے۔

بہر حال عیسائیت میں پوپ کو یہ اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ بائبل کی کوئی بھی تشریح کر دے اور اپنی مرضی سے کوئی بھی فیصلہ سنا دے۔ اس بات پر میں ایک حوالہ دوں گا۔ قرآن کریم کی جب یہ آیت اتری کہ:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ

(التوبہ ۹:۳۱)

''انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی۔''

اس پر عدیؓ ابن حاتم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا۔ بخاری کی روایت ہے۔ عدی حاتم طائی کے بیٹے تھے اور عیسائی تھے۔ حاتم طائی نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا، لیکن وہ اہل حق میں سے تھے۔ حضورؐ سے پہلے جو لوگ حق کا مذہب قبول کرتے تھے تو عیسائیت کا مذہب قبول کرتے تھے۔ کان تنصر۔ حاتم طائی عیسائی ہو گئے تھے اور بت پرستی چھوڑ دی تھی۔ سارا خاندان عیسائی ہو گیا تھا۔ عدیؓ ابن حاتم جب مسلمان ہوئے تو عیسائی سے مسلمان ہوئے۔ عدیؓ ابن حاتم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ قرآن کریم نے ہمارے بارے میں کہا ہے کہ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ، کہ انہوں نے اپنے علما و مشائخ کو رب بنا لیا ہے، لیکن ہم تو اپنے احبار و رہبان کو رب نہیں بناتے تھے۔ قرآن کریم نے یہ بات ہمارے بارے میں کیسے کہی ہے؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، یہ بتاؤ کہ تمہارے احبار و رہبان کو حلال کو حرام قرار دینے اور حرام کو حلال قرار دینے کی اتھارٹی حاصل تھی؟

عدیؓ نے کہا، جی یہ اختیار تو حاصل تھا۔ یعنی کسی حلال کو حلال کی فہرست سے نکال کر حرام کی فہرست میں شامل کر دیں یا کسی حرام کو حرام کی فہرست سے نکال کر حلال کی فہرست میں شامل کر دیں، یہ اختیار تو ان کو حاصل تھا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا، اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ (ترمذی، رقم ۳۰۹۵۔ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۂ توبہ، آیت: ۳۱)۔

حلال و حرام کا اختیار کس کے پاس ہے؟ اللہ کے پاس۔ اگر یہ اختیار اللہ کے سوا کسی کے پاس ہوتی تو پھر کس کے پاس ہوتی؟ انبیا کے پاس۔ اور انبیا میں سب سے بڑے پیغمبر کون ہیں؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اللہ تعالیٰ کیسے مخاطب ہوتے ہیں: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (التحریم ۶۶:۱) اے اللہ کے نبی! ہم نے تو حلال کیا تھا، آپ نے کیسے حرام کر دیا؟ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ۔ ہم تو اس ٹکڑے کا ترجمہ بھی ڈرتے ہوئے کرتے ہیں۔ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (التحریم ۶۶:۲) تو اللہ نے اپنے نبی سے کہا کہ یہ آپ کا اختیار نہیں ہے کہ کسی چیز کو حلال سے حرام کر دیں۔ میں یہ بات واضح کر رہا تھا کہ عیسائیت میں آج بھی پوپ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو حلال سے حرام کر سکتا ہے اور حرام سے حلال کر سکتا ہے۔ عدیؓ ابن حاتم کے سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو حلال و حرام کا اختیار دے دیا جائے۔

اسلام میں حلال و حرام کی اتھارٹی

مگر یہاں ایک سوال ہے کہ حلال و حرام کے اختیار میں پوپ کو دخیل مانیں تو وہ اربابًا من دون اللہ ہے۔ اگر کسی پارلیمنٹ کو حلال و حرام کے اختیار میں دخیل مان لیں تو کیا وہ اربابًا من دون اللّٰہ نہیں ہے؟ اور اگر سوسائٹی کو حلال و حرام کے اختیار میں دخیل مان لیں تو یہ کیا ہے؟ ہم یہی کہتے ہیں کہ نہ پوپ کو، نہ پارلیمنٹ کو اور نہ سوسائٹی کو، نہ مولوی کو، کسی کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حرام قرار دے یا حرام کیے ہوئے کو حلال قرار دے۔ تو میں

اپنے ان دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بھئی، یہ تمہارا مغالطہ ہے کہ پوپ کی طرح کے اختیارات ہمارے پاس بھی ہیں۔ ہمارے پاس ایسے کوئی اختیارات نہیں ہیں۔

ایک بات میں یہاں ضمناً عرض کر دیتا ہوں۔ اسلام میں یہ اختیار کس کو حاصل ہے کہ اس کی بات حتمی ہو اور اس کو چیلنج نہ کیا جا سکے؟ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ دیکھیں، میں بھی مقلد ہوں اور آپ حضرات بھی مقلد ہیں۔ ہم امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقلد ہیں۔ ہم ان پر اعتماد کر کے بغیر دلیل کے بھی ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہر آدمی ہر مسئلے کی تحقیق کر بھی نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں بھی ہم کیا کہتے ہیں؟ مجتهد يخطئ و يصيب ۔ اور ان کا جو فتویٰ ہم بغیر دلیل کے مانتے ہیں، وہ بھی یہ کہہ کر مانتے ہیں کہ صواب يحتمل الخطأ اور اگر کسی مجتہد کا کوئی فتویٰ نہیں مانیں گے تو یہ کہہ کر نہیں مانیں گے کہ خطأ يحتمل الصواب لیکن یہ خطا اور صواب کا تقابل ہوگا نہ کہ حق و باطل کا۔ یہ ہماری حدود ہیں اور یہ صرف امام صاحب کے معاملے میں نہیں، بلکہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے خلیفۃ المسلمین بننے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا، اس میں ایک جملہ کہا تھا کہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے مطابق چلوں گا۔ ان استقمت فاعينوني ، اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دینا۔ فان انا زغت فاقيموني ، اگر سیدھا نہ چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ فلا سمع و لا طاعة ، اگر کتاب و سنت کے مطابق نہ چلوں تو پھر نہ میری بات سنو نہ میری بات مانو۔

کتاب و سنت کے بعد کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اس کی بات حتمی ہو۔ ہاں ہمارے ہاں ترجیح چلتی ہے۔ صواب يحتمل الخطأ، خطأ يحتمل الصواب، مجتهد يخطئ و يصيب ...... یہی ہمارے اصول ہیں اور یہی ہمارے ضابطے ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی، آپ کو مغالطہ ہے کہ جس طرح عیسائیت میں پوپ کوئی حتمی فیصلہ کر دیتا ہے، اسی طرح مولوی بھی حتمی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ نہیں، یہ اختیار نہ پارلیمنٹ کے پاس ہے، نہ مجتہد کے پاس، نہ کسی جماعت کے پاس اور نہ سوسائٹی کے پاس، کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

پاپائیت اور خلافت میں فرق

مغرب کے انسانی حقوق کی تاریخ اور پس منظر بیان کر رہا ہوں۔ مغرب میں آج سے دو سو سال پہلے تک جو صورت حال تھی، وہ صورت حال سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تین مقتدر قوتیں تھیں: پاپائے روم، بادشاہ اور جاگیردار۔ عوام کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ عام آدمی تو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اتھارٹی صرف ان تینوں کے پاس تھی اور ان میں سے سب سے زیادہ اتھارٹی پوپ کے پاس تھی۔ پوپ خدا کا نمائندہ کہلاتا ہے اور پوپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی طور پر جو بھی کہہ دے، وہ خدا کی طرف سے ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اسلام میں یہ تصور نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے ہاں کوئی شخصیت بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کی بات چیلنج نہ کی جا سکے۔ دلیل کی بنیاد پر ہر شخص کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے ہاں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے بڑے تو کوئی نہیں ہیں۔ ان سے بھی لوگ دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں اب بھی کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بہت سے تفردات کو آپ نہیں مانتے۔

ایک بات ضمناً ذہن میں آئی ہے۔ اسلام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام شخصی حکومت کا قائل ہے، یعنی اسلام امیر المؤمنین کے نام سے جو حکومت قائم کرتا ہے، وہ شخصی حکومت ہے اور یہ کہ اسلام ایک شخص کو اتھارٹی بنا دیتا ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ اسلام شخصیت کی حکومت قائم نہیں کرتا، بلکہ دلیل اور قانون کی حکومت قائم کرتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خلیفہ منتخب ہونے کے بعد سب سے پہلے خطبے میں یہ بیان ایک پالیسی بیان ہے کہ اگر میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے اور اگر قرآن و سنت سے ہٹ جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں یہ شخصی حکومت ہے یا قانون کی حکومت ہے؟ حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر یہ اعلان فرماتے ہیں کہ میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری بات مانو، اگر قرآن و سنت سے ہٹ جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ پھر ایک شخص حضرت عمرؓ کے سامنے

کھڑے ہو کر یہ کہتا ہے: لا سمع ، ہم آپ کی بات نہیں سنتے ، پہلے آپ فلاں معاملے کی وضاحت کریں۔ راستے میں جاتے ہوئے ایک عورت نے حضرت عمرؓ کو روکا اور دلیل کے ساتھ کہا کہ آپ کا فلاں فیصلہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت عمرؓ نے وہ فیصلہ واپس لیا۔ میں اس وقت ان واقعات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آیا یہ شخصی حکومت ہے یا قانون کی؟ اور یہ ہمارے اہل سنت کے ہاں ہے۔

خلافت اور امامت میں بنیادی فرق

اہل سنت اور اہل تشیع کا بنیادی اختلاف یہی ہے۔ ہمارے ہاں خلافت تو منصوص ہے، لیکن خلیفہ منصوص نہیں ہے۔ خلیفہ کا انتخاب حضورؐ نے امت پر چھوڑا ہے۔ حضورؐ نے راہنمائی ضرور کی اور اشارات بھی دیے، لیکن عملی طور پر خلیفہ کا انتخاب امت پر چھوڑ دیا۔ امامت اور خلافت میں یہی فرق ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا انتخاب امت کی صواب دید ہے۔

اہل سنت کی خلافت اور اہل تشیع کی امامت میں تین بنیادی فرق ہیں:

پہلا فرق یہ کہ خلافت منصوص نہیں ہے، بلکہ امت کے اختیار پر ہے، جبکہ امامت منصوص ہے۔ اسی لیے اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی رسول اللہ مانتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ خلافت خاندانی یا نسبی نہیں ہے، جبکہ امامت خاندانی ہے۔ یہ خمینی صاحب اور خامنہ ای صاحب وغیرہم تو امام غائب کے نمائندے ہیں۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے اور خلیفہ کی کسی بھی بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، جبکہ امام معصوم ہے اور امام کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ امام جو کہہ دے، وہی قرآن کی منشا ہے اور جو کہہ دے، وہی سنت کا مفہوم ہے۔ امام کے معصوم ہونے کا معنی ہے معصوم عن الخطأ، وہ غلطی سے پاک ہے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ امام اتھارٹی ہے۔

اس لیے میں مغرب سے کہا کرتا ہوں کہ تم ہمیں جو طعنہ دیتے ہو کہ تم میں پاپائیت ہے، وہ ہم جمہور مسلمانوں میں تو نہیں ہے۔ ہمارے ہاں خلیفہ نہ منصوص ہے، نہ خاندانی ہے، نہ معصوم ہے اور

نہ ہی اختلاف سے مستثنیٰ اتھارٹی ہے۔ اگر پاپائیت کا کوئی تصور ہے تو وہ اہل تشیع میں ہے۔ پوپ اور امام تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اب بھی ایران کے دستور میں ولایت فقیہ کے عنوان سے جو شورائے نگہبان ہے، اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ پارلیمنٹ یا صدر کے فیصلے کو بغیر دلیل کے منسوخ کر سکتی ہے۔ شورائے نگہبان میں چھ آیت اللہ ہیں، پانچ قانون دان ہیں اور اس کے سربراہ خامنہ ای صاحب ہیں۔ اس کونسل کو یہ اتھارٹی حاصل ہے کہ جو وہ کہہ دے، وہی دین ہے۔ جو پاپائے روم کی کونسل کو اختیار حاصل ہے، وہی ایران کے دستور میں ولایت فقیہ کے ادارے کو حاصل ہے۔ یہ صوابدیدی اختیارات ہمارے اہل سنت کے ہاں کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں بات دلیل اور قانون کی بنیاد پر ہوگی۔ قرآن و سنت سے حوالہ دینا پڑے گا، اگر مقابلے میں قوی حوالہ آ جائے تو دستبردار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں شخصی نہیں بلکہ قانون کی حکومت ہے۔

میگنا کارٹا، حقوق کی پہلی دستاویز

خیر یہ بات درمیان میں ضمناً آ گئی۔ میں بات کر رہا تھا کہ پاپائے روم، بادشاہ اور جاگیردار کی آپس میں انڈرسٹینڈنگ ہوتی تھی اور عوام الناس کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ یہ تینوں مل کر حکومت کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ان تینوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ جاگیرداروں کو بادشاہ سے شکایات ہوئیں۔ آپ انسانی حقوق کے حوالے سے اکثر ایک لفظ سنتے ہیں، میگنا کارٹا (Magna Carta)۔ اسے انسانی حقوق کی سب سے پہلی باضابطہ دستاویز کہا جاتا ہے۔ تقریباً سات سو سال پہلے تیرھویں صدی عیسوی میں ۱۵ر جون ۱۲۱۵ء کو حقوق کے حوالے سے ایک باضابطہ [illegible] کیا کہ فلاں کے یہ حقوق ہیں، فلاں کے یہ حقوق ہیں اور پھر یہ ضابطہ باقاعدہ نافذ [illegible] آپ مغرب والوں سے انسانی حقوق کے حوالے سے بات کریں گے تو وہ آپ سے یہی کہیں گے کہ ہماری حقوق انسانی کی تاریخ کا آغاز میگنا کارٹا معاہدے سے ہوتا ہے۔ میگنا کارٹا مغرب کے انسانی حقوق کی ابتدا جبکہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا رچارٹر اس کی انتہا ہے۔ میگنا کارٹا ۱۲۱۵ء میں منظور ہوا جبکہ یہ چارٹر ۱۹۴۸ء میں منظور ہوا ہے۔ یہ تقریباً سات صدیوں کا عرصہ بنتا ہے اور ان دو واقعات کے درمیان مغرب کی انسانی حقوق کی تاریخ ہے۔

بنیادی طور پر میگنا کارٹا میں عوام کے حقوق نہیں تھے بلکہ اس وقت کے بادشاہ جان (John) اور جاگیرداروں میں جھگڑے کی بنیاد پر یہ معاہدہ طے ہوا جس میں بادشاہ اور جاگیرداروں کے آپس کے حقوق متعین کیے گئے۔ اس میں کوئی ایک آدھ عوام کا حق بھی تھا۔ اصل جھگڑا بادشاہ اور جاگیردار کا تھا۔ یہ معاہدہ بادشاہ اور جاگیرداروں کے باہمی اختیارات اور حقوق طے کرنے کے لیے کیا گیا۔ اسے مغرب والے انسانی حقوق کی سب سے پہلی دستاویز تصور کرتے ہیں۔

عوام پر پوپ کے مذہبی مظالم

میگنا کارٹا کے تحت بادشاہ اپنے حقوق و اختیارات کا پابند ہو گیا اور جاگیردار اپنے حقوق و اختیارات کے پابند ہو گئے، جبکہ پاپائے روم کو ابھی تک اتھارٹی حاصل تھی کہ وہ جو چاہے کرے۔ پوپ کے اختیارات میں رکاوٹ آئی ہے سائنسی ترقی وانکشافات سے۔ یہ ایک لمبی اور الم ناک تاریخ ہے۔ سائنس نے جب انکشافات کیے کہ چاند یوں گردش کرتا ہے اور سورج اس طرح سے خلا میں سفر کرتا ہے اور زمین اس طرح سے سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو چرچ والے ان انکشافات کو نہ صرف بائبل کی رو سے رد کرتے رہے بلکہ اسے ارتداد قرار دے کر سائنس دانوں اور ماہرین کو سزائے موت دیتے رہے۔ اس طرح چرچ والوں نے ہزاروں ماہرین مار دیے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پہلے چرچ ہوتا تھا۔ وہاں وہ نشانات ابھی تک محفوظ ہیں جہاں پادریوں کی عدالت لگتی تھی، جس میں ایک سائنس دان اپنے دعوے کے ساتھ پیش کیا جاتا کہ چاند گردش کرتا ہے۔ بس پادری فیصلہ سنا دیتے کہ یہ مرتد ہو گیا ہے، اسے قتل کر دو۔ کوئی ماہر کہتا کہ ہوا میں فلاں چیز اس طرح سے کام کرتی ہے، بس اسے خدا کے معاملات میں دخیل سمجھ کر قتل کر دیا جاتا۔ تقریباً دو سو سال تک ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہزارہا افراد قتل کیے جاتے رہے۔

چنانچہ دو باتوں میں چرچ رکاوٹ بنا، ایک سائنسی ترقی میں اور دوسرے آزادئ رائے میں۔ پوپ چونکہ خدا کا نمائندہ تصور ہوتا تھا، اس لیے جو آدمی بھی اس سے اختلاف کرتا، اسے مرتد سمجھ کر قتل کر دیا جاتا اور ایسا اب سے تین سو سال پہلے تک ہوتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں تو خلفائے راشدین سے بھی اختلاف رائے کا حق لوگوں کو حاصل تھا اور بہت سے مواقع پر خلفائے راشدین نے لوگوں

کے اختلاف پر اپنے فیصلے واپس بھی لیے۔ اس کے برعکس چرچ اور پوپ نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ جو بھی اختلاف کرتا ہے، وہ مرتد ہے۔ سائنسی انکشافات اور اختلاف رائے پر ہزاروں لوگ آگ میں جلائے گئے، ہزاروں پھانسی پر چڑھائے گئے، ہزاروں لوگ قتل کیے گئے۔ اس صورت حال نے پوپ کے خلاف بغاوت پیدا کی۔ اب نہ تو سائنسی ترقی رکے گی اور لوگ رائے کا حق بھی نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ چرچ اور پوپ کے ردعمل میں ایک بغاوتِ اٹھی اور اس بغاوت کے نتیجے میں ایک نیا فرقہ وجود میں آیا جسے پروٹسٹنٹ کہتے ہیں۔ یہ پروٹسٹنٹ فرقہ پوپ کی مطلق العنانی، خدائی اختیارات کے استعمال، بائبل کی من مانی تشریح اور متشددانہ رویے کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر آدمی کو بائبل سمجھنے کا حق حاصل ہے اور صرف پوپ بائبل کا ٹھیکیدار نہیں ہے۔ پروٹسٹنٹ کی تحریک میں بہت سے مفکرین نے کام کیا، لیکن مارٹن لوتھر (وفات: ۱۵۴۶ء) کا نام زیادہ نمایاں ہے جو جرمنی کا ایک پادری تھا اور اس نے اصلاح مذہب کی تحریک (Reformation) کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

مولوی کی اجارہ داری؟

اس پس منظر میں اب بالکل یہی صورت حال ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی پیدا کی جارہی ہے کہ ہم قرآن و سنت کی تشریح میں مولوی کی اجارہ داری نہیں مانتے۔ ہم کامن سینس (Common Sense) سے قرآن کی تشریح کریں گے، لیکن یہ بالکل مغالطے پر مبنی ہے۔ مارٹن لوتھر کی تحریک پوپ کی مطلق العنانی کے خلاف تھی کہ پوپ خدا کا نمائندہ تصور ہوتا تھا اور اسے یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ اس کے پاس چاہے دلیل ہے یا نہیں، وہ جو بات کہہ دے گا وہ حتمی ہوگی اور اسے چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔ میں ان دانش وروں سے کہتا ہوں کہ مارٹن لوتھر کی بات ضرور پڑھو، لیکن پس منظر کو بھی تو ٹھیک طرح سے دیکھو۔ کیا ہمارے ہاں قرآن و سنت کی تشریح میں پوپ والی کیفیت ہے؟ ہمارے ہاں تو ہزاروں مسائل میں علمی اختلافات چلے آرہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو دلیل کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کے زمانے سے جو مباحثے شروع ہوئے ہیں، اب تک چلے آرہے ہیں اور قیامت تک چلتے رہیں گے۔ ہم تو بات ہی اختلاف پر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کسی کو یہ

اختیار حاصل ہی نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میری بات آخری اور حتمی ہے۔ اس لیے ہماری مذہبی قیادت کو اگر پوپ پر قیاس کر کے ری ایکشن ہوتا ہے تو یہ سراسر غلط ہے۔ وہ ری ایکشن پوپ کی اجارہ داری پر تھا۔ ہمارے ہاں اجارہ داری شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ دلیل اور قانون کو حاصل ہے۔ آج بھی بڑے سے بڑا عالم کوئی بات کرتا ہے تو اس سے لوگ اختلاف کرتے ہیں کہ نہیں جناب، یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ آج بھی کوئی عالم یا کوئی طبقہ اپنی بات کو حتمی اور آخری قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ یہ غلطی پر ہیں، ہمارے ہاں بالکل مختلف صورت حال ہے۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا مولوی کی اجارہ داری ہے کہ بس وہی قرآن کی تشریح کرے گا؟ میں نے کہا، ہماری بالکل بھی اجارہ داری نہیں ہے۔ میں نے کہا، بھئی آپ خود قرآن کی تشریح کر لیں۔ پھر میں نے پوچھا، کیا قرآن کریم کی تشریح کے لیے آپ کوئی عربی وغیرہ پڑھیں گے یا نہیں؟ کہنے لگے، بالکل پڑھوں گا۔ میں نے پوچھا، کس درجے کی؟ اخبار کے درجے کی یا قرآن کے درجے کی؟ کہا، قرآن کے درجے کی۔ میں نے پوچھا، جب قرآن کی کسی آیت کی تشریح کریں گے تو آپ اس کا بیک گراؤنڈ بھی دیکھیں گے، تاریخ کے حوالے سے بھی یہ پتہ کریں گے کہ یہ آیت کب اور کس موقع پر نازل ہوئی یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے؟ کہا، ہاں یہ تو پتہ کریں گے۔ پھر میں نے پوچھا، اس آیت کی تشریح کرنے سے پہلے کیا آپ یہ دیکھیں گے کہ اس آیت کی حضورؐ نے بھی کوئی تشریح کی ہے یا نہیں؟ کہا، ہاں دیکھیں گے۔ میں نے کہا کہ جب قرآن کریم کی کسی آیت کی تشریح کے لیے یہ علمی ضروریات آپ پوری کر لیں گے تو آپ تو خود مولوی ہو جائیں گے۔ مولوی کسی نسل کا نام تو نہیں ہے۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک زمانے میں ہمارے ہاں یہ بحث چلتی رہی ہے، خاص طور پر جسٹس صاحبان میں کہ اجتہاد کا حق علما کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو ہے۔ جسٹس جاوید اقبال اس کے سرخیل ہیں۔ میں بھی اخبارات میں اس بحث میں حصہ لیتا رہتا ہوں۔ اس ضمن میں دو مسئلوں کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ امت کو ان لوگوں نے تقسیم کر رکھا ہے کہ یہ حنفی ہے، یہ مالکی ہے، یہ شافعی ہے، یہ حنبلی ہے۔ یہ لوگ سب کو گنتے ہیں، جعفری اور ظاہری وغیرہ کو بھی شامل کر

لیتے ہیں۔اس لیے ان مولویوں کو چھوڑ دو اور پارلیمنٹ چونکہ عوام کا منتخب ادارہ ہے، اس لیے اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو دے دو۔ ایک بار مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا جی بالکل، یہ حق آپ پارلیمنٹ کو دے دیں۔ باقی علما نے تو بہت مخالفت کی، جبکہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، یہ اختیار آپ پارلیمنٹ کو دے دیں۔ لیکن میں نے کہا کہ سوچ لیں، اس وقت تو ہم فقہی اعتبار سے چھ سات فرقوں میں ہیں۔ اہل سنت کے ساڑھے چار ہیں، یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور آدھا فرقہ ظواہر کا۔ ظواہر کی اپنی فقہ ہے، اپنا طریقۂ استدلال ہے، اپنے اصول ہیں، اپنا اجتہاد کرتے ہیں، ان کے اپنے فتاویٰ ہیں اور امام داؤد ظاہری اور امام ابن حزم ان کے امام ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اہل سنت کے ساڑھے چار فرقے ہیں۔ دو اہل تشیع کے ہیں، جعفری اور زیدی۔ میں نے کہا کہ ہم مولویوں نے تو امت کو چھ سات فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، لیکن تم جب پارلیمنٹ کو اختیار دے رہے ہو، پارلیمنٹ اجتہاد کرے گی تو مجھے یہ بتائیں کہ پاکستان کی پارلیمنٹ لبنان کی پارلیمنٹ کے اجتہاد کی پابند ہوگی؟ یا مصر کی پارلیمنٹ شام کی پارلیمنٹ کے اجتہاد کی پابند ہوگی؟ تم تو ہمیں کوئی پچاس سے اوپر فرقوں میں بانٹ رہے ہو۔ آگے چلیے، پاکستان میں قومی اسمبلی کا اپنا دائرہ اختیار ہے اور صوبائی اسمبلیوں کا اپنا۔ اب ایسا ہوگا کہ ایک قومی فقہ وجود میں آئے گی، ایک پنجابی فقہ ہوگی، ایک بلوچی فقہ اور ایک سندھی فقہ ہوگی۔ میں نے کہا کہ وہی چھ سات فرقے رہنے دو، تمہاری مہربانی ہوگی۔ ان میں آفاقیت تو ہے نا۔ شافعی انڈونیشیا میں بھی ہیں، مصر میں بھی ہیں۔ تم تو ہر ضلع کی الگ فقہ بنانے پر تلے ہوئے ہو۔

ایک دفعہ ایک قومی اخبار کے زیر اہتمام لاہور میں اس موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق ملنا چاہیے یا نہیں۔ باقی علما نے کہا کہ نہیں، پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق نہیں ملنا چاہیے، میں نے کہا کہ بالکل ملنا چاہیے۔ سب پریشان ہو گئے کہ ایک مولوی یہ بات کہہ رہا ہے کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق ملنا چاہیے۔ میں نے پھر کہا کہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے، لیکن ایک چھوٹی سی شرط کے ساتھ۔ جیسا کہ ہر کام کی اہلیت کی کچھ شرائط ہوتی ہیں، اجتہاد کی اہلیت کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ اب ہر آدمی تو اجتہاد کا اہل نہیں ہے۔ میں

نے کہا کہ الیکشن رولز میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کی شرط لازمی قرار دے دو، یعنی پارلیمنٹ کا رکن وہ بن سکتا ہے جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے تو ہمیں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جن دنوں یہ مذاکرہ ہوا، ان دنوں اسمبلی میں پندرہ سے بیس علماء ممبر تھے۔ میں نے جب یہ بات کہی تو ایک صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب، ہم ان پندرہ بیس مولویوں سے تنگ ہیں، آپ تو پوری اسمبلی مولویوں سے بھرنے کی بات کر رہے ہیں۔

میں نے پھر کہا کہ چلو ہم اجتہاد کی شرائط خود طے نہیں کرتے۔ اگرچہ اجتہاد کی شرائط طے شدہ ہیں کہ فلاں فلاں شرائط جس میں پائی جائیں، وہ مجتہد ہے، لیکن پھر بھی آپ کی تسلی کے لیے میں ان پر اصرار نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی تسلی کے لیے ایک طریقہ آپ کو بتا دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کریں اور سپریم کورٹ سے کہیں کہ وہ اجتہاد کی شرطیں طے کر دے۔ جب سپریم کورٹ یہ شرطیں طے کر دے تو آپ الیکشن رولز میں ترمیم کر کے اسمبلی کی رکنیت کے لیے وہ شرائط لازمی قرار دے دیں۔ میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ میں اس کے حق میں مہم چلاؤں گا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔ میں نے کہا کہ ہم تو دلیل کی، کامن سینس کی اور قانون کی بات کرتے ہیں۔ ہمارا قانون (منصوصات کی حد تک) طے شدہ ہے، اس میں کسی کو رد و بدل کی اجازت نہیں ہے۔ اجتہادی مسائل میں اس کی اجازت ہے، لیکن وہ بھی اس طرح کہ اصل قانون (منصوصات قطعیہ) میں فرق نہ آئے۔

پوپ کے خلاف بغاوت

بہر حال پوپ کے خلاف بغاوت میں پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ بائبل کی تشریح میں پوپ کی اتھارٹی اور اجارہ داری ہم نہیں مانتے۔ اس وقت یورپ کی اکثریت پروٹسٹنٹ ہے۔ چنانچہ پہلی لڑائی بادشاہ اور جاگیرداروں کے درمیان ہوئی جس میں Magna Carta نامی دستاویز سامنے آئی جس کی رو سے بادشاہ اور جاگیرداروں کے درمیان حقوق طے پائے اور اس میں کچھ عوام الناس کے حقوق کا بھی ذکر تھا، جبکہ دوسری لڑائی پوپ اور چرچ کے خلاف ہوئی کہ انہوں نے سائنس دانوں اور ماہرین کو بائبل اور خدا کے قانون کے خلاف قرار

دے کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑائی کے نتیجہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا جس نے بائبل کی تشریح میں پوپ کی اجارہ داری ماننے سے انکار کر دیا۔

اب میں آتا ہوں تیسری بغاوت کی طرف۔ میں اس وقت گزشتہ پانچ چھ سو سال کی مختصر تاریخ بیان کر رہا ہوں، اس دور کی تاریخ جسے ادوارِ مظلمہ کہتے ہیں، یعنی یورپ کا تاریک دور۔ مغرب والے پاپائیت، بادشاہت اور جاگیرداروں کے اس دور کو انسانیت کا تاریک دور Dark Ages قرار دیتے ہیں۔ وہ دور جس میں بس یہ تینوں ہی مل کر سب کچھ کرتے تھے، عام آدمی مظلوم اور بے بس تھا۔

جاگیردار کے مظالم جب حد سے بڑھ گئے تو پھر لوگوں میں بغاوت پیدا ہوگئی۔ عوام میں جاگیرداروں اور بادشاہ کے خلاف بغاوت اٹھی۔ اس بغاوت میں پوپ نے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا۔ تینوں ایک دوسرے کے مفادات کے محافظ تھے۔ جہاں پوپ کو ضرورت پڑتی تھی، بادشاہ اس کا ساتھ دیتا تھا اور جہاں بادشاہ کو ضرورت پڑتی تھی، پوپ اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اس طرح بادشاہ، جاگیردار اور پوپ میں سے جس کو ضرورت پڑتی تھی، دوسرے اس کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ ٹرائیکا تھی۔ ان کا آپس میں گٹھ جوڑ تھا اور یہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے اور عوام کو دباتے تھے۔ عوام تو تین چار سو سال ذبح ہوتے رہے۔ بادشاہ بھی خدا کا نمائندہ ہوتا تھا (السلطان ظل اللہ) اور پوپ تو مذہبی طور پر تھا ہی خدا کا نمائندہ۔

یہاں ایک چھوٹی سی بات کرتا ہوں۔ یورپ میں اگر کسی سے آپ مذہب کے اجتماعی کردار کے نام پر کوئی بات کریں گے تو وہ فوراً طیش میں آجائے گا۔ اس کے طیش میں آنے کی اصل وجہ مغرب کا یہی تاریخی پس منظر ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ یورپ والوں نے مذہب کے نام پر تین چار سو سال انتہائی جبر میں گزارے ہیں۔ بہت ظلم ہوتا تھا، لوگ کاٹ دیے جاتے تھے اور زندہ آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ دو منٹ کی سماعت کے بعد ہی پھانسی کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ اس لیے جب مغرب والوں سے مذہب کی بات کریں تو وہ ڈر جاتے ہیں کہ یہ لوگ وہی جبر کا دور واپس لانا چاہتے ہیں۔ مغرب والوں کی مذہب کے بارے میں کچھ ایسی نفسیات بن گئی ہے۔ مذہب

سے ان کی نفرت بلاوجہ نہیں ہے، لیکن ان کی مذہب سے مطلقاً نفرت تو بہر حال غلط ہے۔

جب پوپ نے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور یہ تینوں اکٹھے ہو گئے تو اب جو بغاوت ہوئی تو ان تینوں کے خلاف ہوئی۔ یہاں بھی درمیان میں ایک بات عرض کرتا چلوں۔ میں اپنے دانش وروں سے کہا کرتا ہوں کہ بھئی تم لوگ مغالطے کا شکار ہو۔ پوپ کے خلاف یورپ کے عوام کی نفرت اور بغاوت سمجھ میں آتی ہے۔ دونوں حوالون سے سمجھ میں آتی ہے۔ بائبل کی تشریح میں اجارہ داری کے حوالے سے بھی اور عوام پر ہونے والے ظلم میں بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دینے کے حوالے سے بھی۔ ہم بھی جب وہ تاریخ پڑھتے ہیں تو بات ہے کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ یورپ کے عوام نے بادشاہ کے ہاتھوں، پوپ کے ہاتھوں اور جاگیردار کے ہاتھوں اتنا ظلم سہا ہے۔ یہ لوگ تو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ میں اپنے دانشوروں سے کہتا ہوں کہ اس صورت حال کا اطلاق ہم پر نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں تو مولوی ہمیشہ عوام میں رہا ہے۔ یہ فرق ضرور ذہن میں رکھنا۔ ایک بات یہ ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے مظالم کا وہ انداز کبھی بھی نہیں رہا۔ شخصی طور پر ظلم ہوتے رہے ہیں۔ اس میں بھی مذہبی طبقے کے کچھ افراد بادشاہوں کے ساتھ ہوتے تھے، لیکن مذہبی طبقہ بحیثیت طبقہ کبھی بھی بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ نہیں رہا۔ مولوی ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مولوی بحیثیت طبقہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے۔ مولوی نے آزادی کی تحریکیں چلائی ہیں، مولوی پھانسی چڑھا ہے، مولوی نے ظالم بادشاہوں کے سامنے کھڑے ہو کر ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے، مولوی نے تو ہمیشہ لوگوں کے حقوق کی ترجمانی کی ہے۔ ہمارے مذہبی طبقے کی تو چودہ سو سالہ تاریخ ہی یہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' پڑھ کر دیکھیں جو ہماری چودہ سو سالہ تاریخ کو بیان کرتی ہے۔ ہمارے ہاں مولوی اور صوفی دونوں عوام کے حقوق کی، آزادی کی اور انصاف کی بات کرتے رہے ہیں اور اس میں وہ کٹے ہیں، پھانسی چڑھے ہیں، زندہ جلے ہیں۔ میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ہمارے سندھ میں اگر جاگیرداروں کے سامنے کسی نے آنے کی ہمت کی ہے تو وہ مولوی ہے۔ جھنگ میں جاگیرداروں کے سامنے کون آیا ہے؟ مولوی۔

جھنگ کی تاریخ تین مولویوں کو یاد رکھے گی جنہوں نے جھنگ میں جاگیرداروں کا طلسم توڑا۔ مولانا محمد ذاکر صاحب، مولانا حق نواز جھنگوی شہید اور مولانا منظور احمد چنیوٹی۔ بلوچستان میں بھی بڑے بڑے نوابوں اور جاگیرداروں سے ٹکر لینے کی ہمت بھی مولوی ہی کرتا ہے۔ تو میں اپنے دانشوروں سے کہتا ہوں کہ مغرب کے تاریک دور کا اطلاق ہم پر نہ کرو۔ اسلام کا مذہبی طبقہ تو ہمیشہ عوام میں رہا ہے اور اس نے ہمیشہ عوام کے حقوق کی ترجمانی کی ہے۔

بہرحال جب مغرب میں بغاوت ہوئی تو چونکہ ان کا مذہبی طبقہ اس بغاوت کے خلاف بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ تھا، اس لیے عوام کی بغاوت پھر ان تینوں کے خلاف ہوئی اور یہ بغاوت ایسی تھی کہ اس نے ان تینوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ یہ بغاوت ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک چلتی رہی۔ جلسے، جلوس، تقریریں، جیلیں، پھانسیاں، مقابلے، لڑائیاں اور جنگیں، یہ سب کچھ ہوا اس بغاوت میں۔ بڑی خوفناک تاریخ ہے اس بغاوت کی۔

یہ تو تھا پہلا مرحلہ جسے یہ میگنا کارٹا کہتے ہیں۔

انقلاب فرانس کا مرحلہ

اس کے بعد دوسرا مرحلہ انقلاب فرانس تھا۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ انسانی حقوق کا آغاز ہمارے ہاں میگنا کارٹا سے جبکہ جمہوری دور کا آغاز انقلابِ فرانس سے ہوا۔ انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء میں رونما ہوا۔ اس میں بادشاہ کو اور بڑے بڑے جاگیرداروں کو قتل کر دیا گیا، چرچ کو ختم کر دیا گیا، پارلیمنٹ پر قبضہ ہوا اور لوگوں نے سارا نظام ختم کر کے ایک جمہوری دور کی بنیاد رکھی۔ اس لیے جب جمہوریت کی ابتدا کی بات ہوتی ہے تو اس کا نقطہ آغاز انقلاب فرانس ہوتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس کی رو سے بادشاہت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی، جاگیرداری بھی ختم کر دی گئی اور چرچ کے ساتھ یہ کیا گیا کہ چرچ کا عمل دخل اجتماعیت کے معاملات میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور اسے صرف مذہبی معاملات تک محدود کر دیا گیا۔ اسی تناظر میں ہم سے بھی کہا جاتا ہے کہ مذہب کا کردار محدود کرو۔ انقلاب فرانس سے پہلے مذہب کی ہر چیز پر اجارہ داری تھی، لیکن انقلاب کے بعد یہ طے پایا کہ پادری کا تعلق صرف فرد کے ساتھ ہے

اور وہ بھی عقیدہ، عبادات اور اخلاقیات کی حد تک ہے اور بس۔ چرچ صرف ان تین باتوں کا ذمہ دار ہے۔ باقی سیاست، قانون، عدالت، معیشت اور تجارت وغیرہ میں مذہب کا کوئی کردار نہیں۔ یہ تقسیم انقلاب فرانس کے بعد ہوئی اور یہ تقسیم پوپ، بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کے خلاف رد عمل کے طور پر ہوئی۔ انقلاب فرانس کے بعد مغرب کا نیا فلسفہ سامنے آیا جسے ہیومنزم اور سیکولرازم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیکولرازم کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک بنیاد یہ ہے کہ مذہب کا اجتماعیت کے معاملات میں کوئی کردار نہیں۔ اس فلسفے کی رو سے مذہب کا کردار صرف تین باتوں تک محدود ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاقیات۔ سیکولرازم کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ سوسائٹی جو بات طے کر دے گی، وہی سسٹم کی بنیاد ہوگی۔ جمہوریت تو سوسائٹی کی خواہش معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جمہوریت کوئی فلسفہ یا نظام نہیں ہے۔ جمہوریت میں ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ اکثریت جس طرف ہوگی، بس وہی سوسائٹی کا فیصلہ ہے۔ اکثریت جس چیز کو حلال کہہ دے، وہ حلال ہے اور جس کو حرام کہہ دے، وہ حرام ہے۔ پارلیمنٹ کو جو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے، اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اصل اتھارٹی تو پارلیمنٹ کی خودمختاری ہے۔

شریعت بل اور پارلیمنٹ کی خودمختاری

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ ہمارے ہاں آج سے کوئی بیس سال پہلے شریعت بل کی ایک تحریک چلی تھی۔ ہم نے خود چلائی، اس کے لیے کام کیا۔ ہمارے دو علما مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف نے سینیٹ میں یہ بل پیش کیا اور اس پر بحث ہوئی۔ اس بل کی بنیادی دفعہ یہ تھی کہ قرآن و سنت کو ملک کے سپریم لا کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات طے ہو جائے گی کہ قرآن و سنت ملک کے بالادست قانون کی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر باقی تمام قوانین ان کے تابع ہو جائیں گے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے میں آپ کو ایک چھوٹا سا حوالہ دیتا ہوں۔

قرارداد مقاصد میں بھی یہی بات لکھی ہے۔ قرارداد مقاصد بطور دیباچہ کے ہمارے دستور میں ہمیشہ شامل رہی ہے۔ قرارداد مقاصد کے ذریعے ہماری سیاست نے کلمہ پڑھا تھا۔ قرارداد مقاصد

لیاقت علی خان مرحوم کے زمانے میں دستور ساز اسمبلی نے پاس کی تھی جس کا دو جملوں میں خلاصہ یہ ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ کی ہے، حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے، لیکن وہ اللہ اور رسول کے احکام کے پابند ہوں گے۔ یعنی عوام کے منتخب نمائندے مطلق العنان نہیں ہوں گے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے دائرے کے اندر رہ کر حکومت کریں گے۔ قرارداد مقاصد کے ذریعے ہم نے یہ اصول طے کر لیا۔ یہ قرارداد مقاصد ۱۹۵۹ء کے دستور میں شامل رہی، پھر ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی شامل رہی، ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی شامل رہی اور اب بھی شامل ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اس سلسلے میں ایک کام کیا۔ پہلے تو قرارداد مقاصد دستور کا ایک دیباچہ تھا۔ دیباچہ ایسے ہوتا ہے جیسے کوئی چیز تبرکاً رکھ دی گئی ہو، یعنی آئین اس سے شروع نہیں ہوتا تھا بلکہ آئین سے پہلے برکت کے لیے دستور میں شامل تھی۔ ضیاء الحق مرحوم نے ایک کام کیا کہ اسے دیباچہ سے نکال کر آئین کے اندر شامل کر دیا۔ یہ کام اس نے بڑے تکنیکی طور پر کیا کہ اس کا نمبر فلاں نہیں بلکہ فلاں شمار ہوگا، لیکن نتیجے کے طور پر قرارداد مقاصد آئین کا حصہ بن گئی۔ قرارداد مقاصد کی رو سے ہماری ریاست نے کلمہ پڑھا کہ ہم خدا کو حاکم اعلیٰ مانتے ہیں۔ ہم تو بہت خوش ہوئے کہ ہمارے لیے اب جنگ آسان ہو گئی۔ اب ہم قوانین کو عدالت میں چیلنج کرتے جائیں گے کہ یہ قانون دستور کے خلاف ہے اور یہ قانون دستور کے خلاف ہے اور اس طرح ہم چند سالوں میں ملک کے مروجہ قوانین کو اسلامی قوانین سے بدل دیں گے، لیکن سپریم کورٹ نے اس کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔

ہوا یوں کہ شرعی قانون کے مطابق قتل کے قصاص کو معاف کرنے کا حق صرف مقتول کے ورثا کو ہے، لیکن پاکستان کے قانون میں یہ اختیار صدر کو بھی حاصل ہے۔ قانون کے مطابق سزائے موت کا مجرم صدر سے رحم کی اپیل کر سکتا ہے۔ صدر اگر اس اپیل کو منظور کر لے تو اس مجرم کو سزائے موت نہیں دی جاتی۔ اس پر لاہور ہائیکورٹ میں ایک رٹ دائر ہوئی کہ صدر کا یہ اختیار شرعاً جائز نہیں ہے اور قرارداد مقاصد کی رو سے ہم پابند ہیں کہ ہم اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہیں چلیں گے، اس لیے صدر کا یہ اختیار دستور کے خلاف ہے، لہٰذا صدر کا یہ اختیار ختم کر دیا جائے۔ اس پر لاہور ہائی

کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ صدر کو کسی کی سزائے موت معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے اور یہ فیصلہ اس بنیاد پر دیا کہ قرارداد مقاصد کے ذریعے چونکہ قرآن وسنت کو بالادست حیثیت حاصل ہے اور صدر کا یہ اختیار قرآن وسنت کے خلاف ہے، اس لیے صدر کا یہ اختیار ختم کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں یہ ایک بڑی پیش رفت تھی۔ اس کے بعد ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ کے فل بنچ نے، جس کے سربراہ جسٹس نسیم حسن شاہ تھے، ہائیکورٹ کا فیصلہ یہ کہہ کر منسوخ کر دیا کہ قرارداد مقاصد کو آئین میں کوئی بالاتر حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ بھی عام دفعات کی طرح ایک دفعہ ہے۔ اب یہ عدالت کی مرضی ہے کہ دستوری دفعات میں تضاد کی صورت میں وہ کس دفعہ کو کس دفعہ پر ترجیح دیتی ہے۔ سپریم کورٹ کے فل بنچ نے، جو قانون کی تشریح میں ہمارے ہاں آخری اتھارٹی ہوتا ہے، یہ فیصلہ دیا اور صدر کا سزائے موت ختم کرنے کا اختیار دوبارہ بحال ہو گیا۔

میں شریعت بل کی بات کر رہا تھا۔ شریعت بل میں یہ دفعہ تھی کہ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دیا جائے۔ اس پر جو سب سے بڑا اعتراض تھا، وہ یہ تھا کہ اس سے پارلیمنٹ کی خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کا تصور یہ ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے اور اسے قرآن وسنت کا پابند کرنے کا مطلب اس کے اختیارات کو محدود کرنا ہے۔ اسی لیے آج مغرب اور مغرب کے نمائندے یہ کہہ رہے ہیں کہ پارلیمنٹ کی خود مختاری بحال کریں۔ یہ بہت سادہ سا جملہ ہے۔ عام آدمی تو یہ سمجھتا بھی نہیں کہ اس کے پیچھے اصل بات کیا ہے۔ یہ تو ہم لوگ جو مبتلی بہ ہیں، ہمیں پتہ ہے کہ پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری سے ان کا مطلب کیا ہے۔

سیکولرازم کی دو بنیادیں

میں سیکولرازم کی دو بنیادوں پر بات کر رہا ہوں۔ ایک بنیاد تو یہ کہ مذہب کا سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ دوسری بنیاد یہ کہ فیصلوں میں اتھارٹی عوام یا ان کے منتخب نمائندے ہوں گے۔ سوسائٹی فیصلہ کرے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس حوالے سے آج کل ایک بہت خوبصورت سا عنوان سامنے آتا ہے، ''سول سوسائٹی''۔ اب سول سوسائٹی کس بلا کا نام ہے؟

یہ سول سوسائٹی وہی مغرب کی خرافات ہے جو یہ لوگ یہاں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم ان لوگوں کے عنوانات کو اور ان کی اصطلاحات کو بھی سمجھ نہیں پاتے اور ہمیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون کس بینڈ سے بول رہا ہے اور کیا بول رہا ہے۔ سول سوسائٹی کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح مغرب میں سوسائٹی اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرنے میں اتھارٹی ہے اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہونا چاہیے۔ جبکہ ہم سوسائٹی کو منصوصات میں اتھارٹی نہیں مانتے۔ ہم سوسائٹی کی خواہشات کا مطلقاً انکار نہیں کرتے، لیکن ہم سوسائٹی کی خواہشات کے نام پر، پارلیمنٹ کی خود مختاری کے نام پر قرآن و سنت کی نفی کے متعلق تو ہم سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ تو سیکولرازم کا معنی یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں اتھارٹی سوسائٹی ہوگی، وہ جو چاہے فیصلہ کرے۔ حلال کرے، حرام کرے، جو مرضی کرے، اسے کوئی چیلنج کرنے والا نہیں اور یہ کہ مذہب کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

دو پادری صاحبان سے گفتگو

یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔ امریکہ کا ایک شہر ہے اٹلانٹا۔ وہاں ہمارے ایک دوست افتخار رانا رہتے ہیں۔ پہلے پاک فوج میں میجر تھے، اب کافی عرصہ سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ یہاں کوئی سمجھ دار سا پادری ہو تو اس سے میری ملاقات کرواؤ۔ چنانچہ افتخار رانا صاحب نے وہاں کے بیپٹسٹ فرقے کے سربراہ سے میری ملاقات کروائی۔ افتخار ہمارے درمیان ترجمان تھے۔ افتخار نے انہیں میرے متعلق بتایا کہ پاکستان سے مسلمانوں کے ایک مذہبی راہ نما یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پادری صاحب سے کہا کہ میرے بھائی! یہ جو آپ کی امریکہ کی سوسائٹی ہے، اس میں آپ لوگوں نے مذہب کو بالکل اپنی زندگیوں سے بے دخل کر دیا ہے۔ لوگ شراب پیتے ہیں، زنا کرتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، کھلم کھلا ہم جنس پرستی کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں ان معاملات میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ ایک مذہب کے نمائندہ ہیں۔ بائبل شراب کو حرام کہتی ہے، زنا کو حرام کہتی ہے۔ نوے فیصد قوانین و احکام قرآن اور بائبل کے ایک جیسے ہیں۔ آپ لوگ اس

سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟ میں نے پادری صاحب سے کہا کہ زنا، شراب، جوا، سود، ہم جنس پرستی، یہ سب چیزیں آپ کے ہاں بھی حرام ہیں۔ آپ لوگ ایک مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں، اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

پادری صاحب امریکہ کے دستور کے حوالے سے بات کرنے لگے تو میں نے کہا کہ امریکہ کے دستور کا تو مجھے بھی پتہ ہے، ہم اس وقت دستور کی بات نہیں کر رہے۔ میں تو آپ کی بات کر رہا ہوں، بائبل کے نمائندے کی بات کر رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ میں اتوار کو ایک درس دیتا ہوں جس میں جو بھی لوگ آتے ہیں، میں ان کو بائبل کی تعلیمات سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ درس میں کوئی ڈیڑھ دو سو لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کل آپ جب حضرت عیسیٰ (Jesus) کے سامنے پیش ہوں گے تو کیا آپ اس بات سے انہیں مطمئن کر لیں گے کہ اٹلانٹا کی دس لاکھ کی آبادی میں آپ چند سو لوگوں کو اتوار کے دن ایک مختصر سے درس میں بائبل کی تعلیم دیتے رہے؟ اس پر پادری صاحب نے بے چارگی سے کہا کہ میں اس سلسلے میں اور کیا کر سکتا ہوں؟

میں نے پادری صاحب سے کہا کہ میں آپ سے ایک مذہب کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے معاشرے میں اسی کردار کی توقع کر رہا ہوں جو میں اپنے معاشرے میں ادا کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ ہم اپنے معاشرے میں خدائی احکامات کی خلاف ورزی کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ آپ کے ہاں تو یہ بات نافذ ہو چکی ہے کہ مذہب کا سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بائبل لاتعلق، چرچ لاتعلق، پادری لاتعلق، جبکہ ہمارے ہاں یہ نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم اس کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہیں۔ ہمیں اسمبلی میں موقع ملتا ہے تو اسمبلی میں مزاحمت کرتے ہیں، بازار میں موقع ملتا ہے تو بازار میں کرتے ہیں، منبر پر موقع ملتا ہے تو منبر پر کرتے ہیں، اخبار میں موقع ملتا ہے تو اخبار میں کرتے ہیں۔ ہم نے تو ایک شور مچایا ہوا ہے کہ ہم سوسائٹی کو خدائی احکامات وقوانین سے منہ نہیں موڑنے دیں گے۔ ہم لوگ اس ذہن کی مزاحمت کر رہے ہیں کہ مذہب کا تجارت، سیاست، معیشت، عدالت اور دیگر کاروبارِ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

میں نے پادری صاحب سے کہا کہ آپ لوگ بھی اس کی معاشرتی سطح پر مزاحمت کریں۔ سیکولر ازم یعنی مذہب کی ہمارے اجتماعی معاملات میں بے دخلی کا فلسفہ تمہارا بھی دشمن ہے اور ہمارا بھی دشمن ہے۔ کیا مولوی اور پادری اس کے خلاف اکٹھے نہیں ہو سکتے؟ یہ جو مذہب سے دستبرداری اور مذہب کی بے دخلی ہے، اس کے خلاف ہم مل کر جنگ کرتے ہیں۔ جب ہم لوگ اس فلسفے کو شکست دے دیں گے تو تم اپنے معاشرے میں بائبل نافذ کر دینا، ہم اپنے معاشرے میں قرآن نافذ کر دیں گے۔ ظاہر ہے عیسائیوں میں تو بائبل ہی نافذ ہوگی، قرآن تو مسلمانوں میں نافذ ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہماری بات چیت کے دوران ہی میرے دوست جو ہماری ترجمانی کر رہے تھے، مذاق سے کہنے لگے ''کیوں مرواؤ ایں اینوں؟'' یعنی کیوں اس غریب کو مروانا ہے۔ پادری صاحب کہنے لگے کہ آپ تو عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ ہم نے مسلمانوں سے ایسی باتیں پہلے کبھی نہیں سنیں۔ میں نے کہا، میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ ایک فورم پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب ہم یہ جنگ جیت جائیں تو مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم امریکہ میں بائبل نافذ کر دینا، لیکن پھر میں بھی یہ حق مانگوں گا کہ پاکستان میں قرآن نافذ کروں۔

یہ جو میں نے قصہ سنایا، یہ امریکہ کے ایک پادری صاحب تھے۔ اب برطانیہ کے ایک پادری صاحب کا قصہ سناتا ہوں۔ نوٹنگھم برطانیہ کا ایک بڑا شہر ہے۔ ہم نے وہاں کے ایک بڑے پادری صاحب سے گپ شپ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا عیسیٰ منصوری، مولانا رضاء الحق، مفتی برکت اللہ اور میں خود تھا۔ ہم لوگوں نے پادری صاحب سے وقت لیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔ ان سے بھی میں نے یہی بات کی کہ جس معاشرے میں آپ لوگ مذہب کے نمائندے ہیں، یہاں زنا، عریانی، شراب، ناچ گانا، سود، جوا، ہم جنس پرستی اور ان جیسے دوسرے قبیح کام کھلے عام ہو رہے ہیں۔ نفسانی خواہشات کی حکمرانی ہے اور خدائی حدود کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ مذہب کی، چرچ کی، بائبل کی، Jesus کی، خدا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ لوگ اس معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا سوچ رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ ظاہر ہے یہ بالکل غلط ہو رہا ہے۔

یہ خدا اور Jesus سے بغاوت ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس کا کوئی حل ہے؟ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ پادری صاحب کی بات دہراتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو چمک اور روشنی ان مسائل کے حل کے لیے درکار ہے، وہ ہمیں آپ لوگوں کی آنکھوں میں نظر آ رہی ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ جو مغرب کے پڑھے لکھے سمجھدار پادری صاحبان ہیں، ان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو تلاش میں ہیں، انتظار میں ہیں کہ ان سے اس مسئلے پر بات چیت کی جائے، بلکہ وہ تو ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان کی رہنمائی کریں۔ وہ ہمیں مذہب کے معاملات میں سینئر سمجھتے ہیں اور یہاں ہم ہیں کہ ہم سے اپنے لوگوں کی رہنمائی نہیں ہو پا رہی۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر

حضراتِ محترم! ہمارا موضوع ہے: اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اسلامی تعلیمات۔ میں نے اس کا پس منظر آپ کے سامنے بیان کیا ہے کہ اصل میں یہ جھگڑا کیا ہے۔ اس پس منظر میں ہم اب تک انقلاب فرانس تک پہنچے ہیں جسے انسانی حقوق کی دوسری دستاویز قرار دیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کی پہلی دستاویز میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کو جبکہ دوسری دستاویز انقلاب فرانس کے نتیجے میں (۱۷۸۹ء) تیار ہونے والی دستاویز ''انسان کے حقوق کا اعلامیہ' (Declaration of the Rights of Man) کو کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے بعد جاری ہوا۔ اسی کی بنیاد پر اب تک انسانی حقوق کے حوالے سے یہ سارا قصہ چلا آ رہا ہے۔ اس کی رو سے مذہب کی اور جاگیرداری کی تو چھٹی ہوگئی۔ بادشاہ اگر ہے بھی تو بے اختیار ہے، جبکہ سارے اختیارات سوسائٹی کو منتقل ہو گئے اور سوسائٹی یا اس کے منتخب نمائندے اتھارٹی بن گئے۔ یہ جمہوریت کا نقطہ آغاز ہے۔ گویا مغربی جمہوریت کی تاریخ کوئی سوا دو سو سال پرانی ہے۔

انقلاب فرانس کے بعد تیسری بڑی دستاویز اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس درمیانی عرصہ میں اور بھی چھوٹے موٹے کنٹریکٹس بنتے رہے، لیکن ایک جامع دستاویز کے طور پر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو اس سلسلے کی تیسری بڑی دستاویز شمار کیا جاتا ہے۔ یہ چارٹر اقوام متحدہ

نے تیار کیا اور جنرل اسمبلی نے اسے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کیا۔ یہ چارٹر تیس دفعات پر مشتمل ہے جس پر ہم بعد میں بات کریں گے، لیکن اس سے پہلے دو باتیں واضح کرنا چاہوں گا۔ پہلی یہ کہ اقوام متحدہ دراصل کیا ہے۔ دوسری یہ کہ اس انسانی حقوق کے چارٹر کی اخلاقی و قانونی حیثیت کیا ہے۔ ان دو باتوں کی وضاحت کے بعد ہم انسانی حقوق کے چارٹر کی طرف آئیں گے۔

۱۹۱۴ء کے لگ بھگ پہلی جنگ عظیم ہوئی۔ دنیا کے ممالک آپس میں ٹکرائے۔ ہمارا بھی اس جنگ عظیم میں ایک کردار تھا۔ اس کردار کی ہمیں سزا بھی مل رہی ہے۔ اس جنگ میں جرمنی ایک طرف تھا جبکہ باقی یورپ دوسری طرف تھا۔ اس وقت خلافت عثمانیہ قائم تھی جس کا مرکز ترکی تھا۔ خلافت عثمانیہ نے سپر پاور کے طور پر دنیا میں تقریباً ساڑھے چار سو سے پانچ سو سال گزارے ہیں۔ درمیان میں دو صدیاں تو تقریباً ایسی رہی ہیں کہ اس وقت امریکہ کو دنیا میں جو پوزیشن حاصل ہے، وہی پوزیشن سلطنت عثمانیہ کو دنیا میں حاصل رہی ہے۔ اس وقت جیسے امریکہ کا وائٹ ہاؤس ہے، اس طرح سلطنت عثمانیہ کا ہیڈ کوارٹر باب عالی کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ باب عالی کی مرضی کے بغیر دنیا میں کوئی چیز حرکت نہیں کرتی تھی۔ امریکہ تو چند سالوں میں تھک گیا ہے، جبکہ ہم نے صدیوں اس پوزیشن پر اپنا کردار ادا کیا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارا اگلا راؤنڈ بھی آنے والا ہے۔ یہ درمیان میں مار کھانے کا بھی ایک پیریڈ آ گیا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے بعد برطانیہ نے دنیا میں سپر طاقت کے طور پر راج کیا ہے۔ برطانیہ ایک صدی میں تھک گیا تھا، روس پون صدی میں، جبکہ امریکہ تو اس سے بھی جلدی تھک رہا ہے۔ امریکہ کے بعد اب کسی اور کی باری ہے جس سے ہم نے ابھی مار کھانی ہے، لیکن اس کے بعد پھر ہماری باری ہے، ان شاء اللہ العزیز۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں بہت تباہی ہوئی جس کے بعد انجمن اقوام (League of Nations) کے نام سے ایک ادارہ بنا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ سا فلسفہ آپ کو بتاتا ہوں کہ جب عام لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو ان میں پولیس، عدلیہ وغیرہ تصفیہ کرواتی ہے۔ ادارے آپس میں لڑ پڑیں تو حکومت ان میں صلح صفائی کراتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ حکومتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی

صلح کون کروائے؟ تو انجمن اقوام ایک ایسا ادارہ بنا کہ ممالک آپس میں لڑ پڑیں تو ایک ادارہ ایسا ہو جو لڑائی کو روکے، جھگڑے نمٹائے اور صلح کروائے۔ انجمن اقوام کچھ عرصہ چلی، لیکن ناکام ہوگئی۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے یوں تبصرہ کیا تھا کہ:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یعنی گورکنوں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنالی ہے کہ یہ قبریں میں نے کھودنی ہیں اور یہ قبریں تم نے کھودنی ہیں۔ وہ انجمن ناکام ہوگئی کہ اس کی موجودگی میں بھی دوسری جنگ عظیم ہوگئی۔ بڑی خوفناک جنگ ہوئی۔ یورپ میں، ایشیا میں، افریقہ میں، بہت تباہی پھیلی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سے زیادہ مضبوط بنیادوں پر اقوام متحدہ بنائی گئی۔

اقوامِ متحدہ کا قیام

اقوام متحدہ ۱۹۴۵ء میں بنی۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد اقوام اور ممالک کے درمیان تنازعات کو حل کرنا، تصادم کے امکانات کو روکنا، اگر تصادم ہو جائے تو درمیان میں ثالثی اور تحکیم کا کردار ادا کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ نے یہ دیکھا کہ یہ جھگڑے ہوتے کیوں ہیں، ان کی وجوہات کیا ہیں۔ کچھ اصول ہونے چاہئیں جو یہ طے کریں کہ یہ بات انصاف کی ہے اور یہ بات ناانصافی کی ہے۔ فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط ہے۔ چنانچہ اس میں انہوں نے اپنا فلسفۂ زندگی بھی شامل کرلیا۔ اس سلسلے میں یہ چارٹر منظور کیا گیا اور طے پایا کہ اب دنیا میں تمام تنازعات، مقدمات اور معاملات اس منشور کی بنیاد پر طے ہوا کریں گے۔ اسے آپ ایک بین الاقوامی دستور سمجھ لیجیے کہ اقوام و ممالک کے آپس کے تنازعات اب اس دستور کی روشنی میں طے کیے جائیں گے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ممالک اقوام متحدہ کے ممبر ہیں۔ ہم بھی ممبر ہیں۔

اقوام متحدہ کا ڈھانچہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک جنرل اسمبلی اور ایک سلامتی کونسل ہے۔ جنرل اسمبلی کا ہیڈ کوارٹر امریکہ کے شہر نیویارک کے ایک جزیرہ مین ہیٹن (Manhattan) میں

ہے۔اس کے کچھ دفاتر سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں بھی ہیں۔ جنرل اسمبلی کا ہر سال اجلاس ہوتا ہے جس میں اس کا ہر ممبر شریک ہوتا ہے۔ وہاں لمبی تقریریں ہوتی ہیں اور یہ دنیا کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس پر دنیا کے کسی بھی ملک کا حکمران آ کر جو مرضی کہہ دے۔ یہ سمجھ لیں کہ انٹرنیشنل ہائیڈ پارک کارنر ہے۔اصل ہائیڈ پارک کارنر تو لندن میں ہے۔لندن کے وسط میں ایک بہت بڑا باغ ہے۔ اس باغ میں ایک کونہ ایسا ہے کہ اس میں کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت جا کر کوئی بھی تقریر کر سکتا ہے۔ یہ ایک بہت مزے کی جگہ ہے۔ وہاں پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ آپ وہاں جا کر برطانیہ کی بادشاہت کے خلاف بات کریں، عیسائیت کے خلاف کریں، دستور کے خلاف کریں، وزیر اعظم کے خلاف کریں، آپ چاہے وہاں گالیاں دیں، جو مرضی کہہ دیں، آپ کو پوری آزادی ہے۔ ہم کبھی کبھی وہاں شام کو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی ایک جگہ کھڑا تقریر کر رہا ہے، کوئی دوسری جگہ کھڑا اپنی ہانک رہا ہے۔ایک عجیب تماشا لگا رہتا ہے۔اسے ہائیڈ پارک کارنر کہتے ہیں۔ اس کونے میں کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔جس کا جب جی چاہے، وہاں اپنے دل کا غبار نکال لے۔

عام منظر یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص تین آدمی لے کر ایک جگہ کھڑا ہے، کوئی چار آدمی لے کر کھڑا ہے، کسی کے حصے میں ذرا زیادہ لوگ آ جاتے ہیں جنھیں وہ اپنی تقریر سنا رہا ہوتا ہے۔ کوئی امریکہ کے خلاف، کوئی اسلام کے خلاف، کوئی عیسائیت کے خلاف، جس کا جس کے خلاف جی چاہتا ہے، اپنی بھڑاس نکال رہا ہوتا ہے۔تو میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو انٹرنیشنل ہائیڈ پارک کارنر کہا کرتا ہوں۔

ستمبر میں جنرل کونسل کا اجلاس شروع ہوتا ہے جو تین مہینے تک جاری رہتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک کے نمائندے وہاں پہنچتے ہیں۔ کسی بھی ملک کے صدر، وزیر اعظم یا نمائندے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہاں جا کر تقریر کرے اور جو مرضی کہے۔یعنی ہر ملک وہاں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ تو جنرل اسمبلی کی پہلی حیثیت ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ جنرل اسمبلی کسی مسئلے پر کوئی قرارداد بھی پاس کر سکتی ہے، لیکن اس قرارداد کی حیثیت بس سفارش کی ہوتی ہے۔اس وقت جنرل اسمبلی میں بے شمار قراردادیں پڑی ہوئی ہیں۔ اسرائیل کے خلاف بے شمار ہیں، انڈیا کے

خلاف ہیں، اور بھی ملکوں کے خلاف بھی ہیں۔ بس وہیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان قراردادوں کی حیثیت سفارش سے زیادہ نہیں ہے۔ جنرل اسمبلی کا مقصد ایک تو دنیا کے ممالک کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے، جس پر وہ اپنے دل کا غبار نکال سکیں اور دوسرے کسی مسئلے پر اپنی سفارش پیش کرنا ہے۔

اقوام متحدہ کا اصل ادارہ سلامتی کونسل ہے۔ اس کے پانچ مستقل اور چھ غیر مستقل ممبر ہوتے ہیں۔ پانچ مستقل ممبر جو ہیں، وہ ہمیشہ یہی رہیں گے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، چین اور فرانس۔ اور چھ ممبر غیر مستقل ہوتے ہیں جو دو سال کے عرصے کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس کے گروپ تقسیم ہیں کہ اس دفعہ افریقہ سے ممبر آئے گا اور اس دفعہ ایشیا سے آئے گا۔ دنیا کے ممالک ووٹ دے کر اپنا نمائندہ ملک منتخب کرتے ہیں۔ تو سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبر ہیں جبکہ چھ غیر مستقل ہیں جو ہر دو سال کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ پانچ مستقل ممبرز کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کو دنیا کے ممالک سے ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ ان کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ جنرل اسمبلی کی حیثیت تو بس قراردادیں منظور کرنے کی ہے جبکہ سلامتی کونسل کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جو فیصلہ کر دے، وہ دنیا میں نافذ ہوتا ہے۔ یہ جو دنیا کے مختلف ممالک کے خلاف فوجیں بھیجی جاتی ہیں، اقتصادی ناکہ بندیاں ہوتی ہیں اور بمباریاں ہوتی ہیں، یہ سب سلامتی کونسل کے فیصلوں کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔ پانچ مستقل ممبرز کو ویٹو پاور حاصل ہے جسے حق استرداد کہتے ہیں۔ یعنی گیارہ ممبر بیٹھ کر کوئی فیصلہ کریں تو ان پانچ مستقل ممبرز میں سے کوئی بھی اس فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ بس وہ فیصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے کسی بھی مسئلے پر ان پانچ مستقل ممبرز کا اتفاق ضروری ہے۔ باقی سب رسمی کارروائی ہے۔ اصل طاقت ان پانچ ممالک کے پاس ہے۔ اگر کسی مسئلے پر ان پانچ ممالک میں سے کوئی ایک متفق نہ ہو تو پھر چاہے ساری جنرل اسمبلی ایک طرف ہو جائے اور سلامتی کونسل بھی اس کے ساتھ ہو جائے، وہ فیصلہ نافذ نہیں ہوتا۔

اقوامِ متحدہ اور اسلامی دنیا

اقوام متحدہ کا یہ نظام ۱۹۴۵ء سے چلا آ رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے ڈھانچے کے حوالے سے

ہمارے دو تحفظات ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ جو پانچ مستقل ممبر ہیں جن کے ہاتھ میں اصل پاور ہے، جن کے فیصلے پوری دنیا میں نافذ ہوتے ہیں، جن کو فیصلہ کرنے یا فیصلہ کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہے، ان میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کے اٹھاون مسلمان ممبر ملکوں میں سے کوئی بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ سازی میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم دنیا کی آبادی کا اگر چوتھا نہیں تو پانچواں حصہ ضرور ہیں۔ دنیا کی آبادی کا اتنا بڑا حصہ ہونے کے باوجود ہماری اقوام متحدہ کی فیصلہ سازی میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اتنی اہمیت ہونے کے باوجود فیصلہ سازی کے عمل میں ہماری کوئی شرکت نہیں ہے۔ ملائیشیا کے سابق حکمران مہاتیر محمد نے متعدد بار یہ مسئلہ اٹھایا کہ کوئی فارمولا طے کر کے مسلمانوں کو اس پانچ کے گروپ میں شامل کیا جائے، لیکن ان کے علاوہ مسلم ممالک میں سے کوئی یہ آواز نہیں اٹھاتا۔

ہمارے دو تحفظات میں سے دوسرا یہ ہے کہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر جسے ایک بین الاقوامی معیار بنایا گیا ہے، یہ ۱۹۴۸ء میں جس وقت طے ہوا تھا، اس وقت اقوام متحدہ میں ہماری نمائندگی مکمل نہیں تھی۔ مسلم ممالک اکثر غلام تھے، آزاد نہیں تھے۔ اس چارٹر میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمارے مذہب اور ثقافت سے متصادم ہیں۔ اس پر بھی مہاتیر محمد نے آواز اٹھائی کہ اس چارٹر پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔ اسلامی و ملی نقطہ نظر سے اقوام متحدہ کا چارٹر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ عملاً تو ہم نے اس کی پابندی قبول کی ہوئی ہے، لیکن نظریے اور شرعی اعتبار سے تبھی قابل قبول ہو سکتی ہے جب ہماری یہ دو باتیں مانی جائیں۔ ایک یہ کہ فیصلہ سازی میں ہماری کوئی حیثیت ہو۔ دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی ہو کیونکہ اس میں کچھ باتیں اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی اقدار سے متصادم ہیں۔ جس طرح دنیا کے باقی معتقدات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس طرح اس چارٹر میں ہمارے معتقدات کا لحاظ بھی رکھا جائے اور ہمارے ساتھ مشاورت سے اس پر نظر ثانی ہو جائے۔ تب اقوام متحدہ کی رکنیت ایک بین الاقوامی معاہدے کے درجے میں ہمیں قابل قبول ہو سکتی ہے۔

اقوام متحدہ اس وقت دنیا کے تقریباً تمام شعبوں میں حاوی ہے۔ اقوام متحدہ کے شعبوں میں

تعلیم، صحت، ہیومن رائٹس، معیشت وغیرہ کے شعبے نمایاں ہیں۔ اقوام متحدہ کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی اخلاقی معاہدہ ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاہدے کی خلاف ورزی پر دنیا کے ملکوں کے خلاف اقتصادی ناکہ بندیاں، جنگی کارروائیاں اور فوج کشیاں ہوتی ہیں، حکومتیں تک ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس معاہدے کی کسی بات کی خلاف ورزی پر سلامتی کونسل دنیا کے ملکوں کے خلاف فیصلے کرتی ہے اور اس کے فیصلے عملاً نافذ ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو اخلاقی معاہدہ کہا جائے۔ میں اسے Undeclared International Constitution کہتا ہوں۔ اقوام متحدہ غیر علانیہ لیکن عملاً ایک حکومت ہے اور اس کا چارٹر عملاً بین الاقوامی دستور ہے۔ قانونی اور اخلاقی معاہدہ میں تو یہی فرق ہوتا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی پر کارروائی کی جاتی ہے جبکہ اخلاقی معاہدہ کی خلاف ورزی پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔

ہیومن رائٹس کے چارٹر کی بنیاد

اقوام متحدہ کے تعارف میں یہ لکھا ہے کہ اقوام متحدہ کی رکنیت تمام امن پسند ملکوں کے لیے عام ہے۔ جب کوئی ملک اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کرتا ہے تو وہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج مقاصد وقوانین کو قبول کرتا ہے، اس لیے جب بھی کوئی ملک اقوام متحدہ کا ممبر بنے گا، وہ پہلے اس چارٹر کو قبول کرے گا۔ یہ چارٹر اقوام متحدہ کا دستور العمل ہے جس سے عالمی امن کے لیے رکن ملکوں کی امیدوں کا اظہار ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر کام کرنے میں یہ راہ نما حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت (جس وقت یہ تعارف لکھا گیا) کل ملکوں کی تعداد ۱۸۹ تھی۔ اب اقوام متحدہ کے رکن ملکوں کی تعداد ۱۹۰ سے بڑھ چکی ہے اور کوسوو کے شامل ہونے سے مسلم ممالک کی تعداد ۵۹ ہو جائے گی۔ یہ تقریباً تیسرا حصہ بنتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے اس چارٹر کی تمہید میں لکھا ہے کہ

> ''چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور نا قابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا اس دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے،

چونکہ انسانی حقوق سے لاپروائی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جس سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں، عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ ہو،

چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے، اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آکر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے،

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے،

چونکہ اقوام متحدہ کی ممبر قوموں نے اپنے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت اور قدر اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے،

چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کروائیں گے،

چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں،

لہٰذا جنرل اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کی بتدریج کوشش کر سکے۔"

یہ حیثیت ہے اقوام متحدہ کے چارٹر کی۔ دو باتیں آپ یہاں پھر ذہن میں لے آئیں۔ پہلی یہ کہ کسی بھی ملک کو اقوام متحدہ کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس چارٹر کو قبول کرے۔ دوسری یہ کہ اس چارٹر کی حیثیت ایک ایسے بین الاقوامی معاہدے کی ہے جس پر عمل ہر ملک کے لیے

ضروری ہے۔اس میں تعلیم و تبلیغ بھی ہوگی اور قومی و بین الاقوامی کارروائیاں بھی ہوں گی۔گویا عملاً اس منشور کو اس وقت دنیا میں بین الاقوامی دستور کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک بات میں درمیان میں عرض کرتا چلوں۔ ہمارے ہاں ایک فکری اور قانونی الجھن پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے دستور میں ہم نے قرارداد مقاصد بھی منظور کی کہ ہم حاکم اعلیٰ اللہ کو تسلیم کرتے ہیں،عوام کے منتخب نمائندے قرآن و سنت کے پابند ہو کر حکومت کریں گے۔دستور میں ہم نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کا ریاستی مذہب اسلام ہے اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور یہ بھی کہ پارلیمنٹ پابند ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو اسلامی شکل دے۔آپ کے خیال میں دستور میں یہ ساری باتیں ہونے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟ دستوری زبان میں قرآن و سنت کی بالادستی اور نفاذ کی جتنی بات ہم کر سکتے ہیں،اس سے کہیں زیادہ پاکستان کے دستور میں موجود ہے،لیکن اس پر عمل نہیں ہو پا رہا۔وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں تضاد ہے۔دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کی گارنٹی بھی موجود ہے،لیکن اس کے ساتھ دستور میں انسانی حقوق کے چارٹر کی بالادستی کی گارنٹی بھی موجود ہے۔چنانچہ یہ دو گارنٹیاں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ ہمارے ہاں ساٹھ سال سے جو کھیل کھیلا جا رہا ہے،وہ انہی دو گارنٹیوں پر کھیلا جا رہا ہے۔ جب کوئی اسلامی ذہن کا آدمی آتا ہے تو اسلام والی گارنٹی سے فائدہ اٹھا لیتا ہے جیسا کہ ضیاء الحق نے اٹھایا کہ قرارداد مقاصد دستور میں شامل کر دی،شرعی عدالت قائم کر دی،حدود آرڈیننس جاری کر دیے،وغیرہ۔اور اگر کوئی غیر اسلامی ذہن کا آدمی آتا ہے تو انسانی حقوق کی گارنٹی سے فائدہ اٹھاتا ہے جیسا کہ پرویز مشرف نے کیا۔تو یہ ایک مستقل کشمکش ہمارے ملک میں چل رہی ہے اور ہم لوگ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔یہ ہے اصل لڑائی۔اس لڑائی میں ہمیں مار پڑتی ہے،ہمارے خلاف پراپیگنڈا ہوتا ہے،ہمیں وحشی کہا جاتا ہے،درندگی والا کہا جاتا ہے،غیر انسانی کہا جاتا ہے،دہشت گرد بھی کہا جاتا ہے،اور بھی نہ جانے کون کون سے الزامات ہم پر لگائے جاتے ہیں۔ان سب کی بنیاد دراصل یہی ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور اور اسلامی تعلیمات

یہ تو تھا اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا پس منظر۔ اب ہم اس چارٹر کی چند دفعات کا شق وار جائزہ لیتے ہیں۔ اس میں دو باتیں زیر بحث آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ اس چارٹر کے حوالے سے بین الاقوامی حلقوں کے ہمارے قوانین پر کیا اعتراضات ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس چارٹر کے حوالے سے شرعی نقطہ نظر سے ہمارے تحفظات کیا ہیں۔

انسان کی عزت و تکریم

دفعہ نمبر ۱:

''تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے، اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔''

تبصرہ:

اصولاً اس شق پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انسانی مساوات کی تعلیم اسلام نے بھی دی ہے۔ حضرت عمر کے زمانے میں ایک گورنر نے کسی کو بلاوجہ مارا تو اس پر حضرت عمر فاروق ؓ نے کہا تھا کہ مذ کم تعبدتم الناس ولقد ولدتھم امھاتھم أحرارا!(ابن عبدالحکم، فتوح مصر، ص ۱۹۰) تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے؟ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔

البتہ اس دفعہ کی تطبیق کے لحاظ سے ہمارا ایک تحفظ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ عزت و تکریم کے لحاظ

سے سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں، لیکن جب یہ تطبیق کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عزت نفس کے اعتبار سے بھی سب انسان برابر ہیں۔ اس میں ہمیں تھوڑا سا کلام ہے۔ ہم جب بات کرتے ہیں تو ہم دو مرحلوں میں بات کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (التین ۹۵: ۴،۵)۔ ایک اور مقام پر ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰)۔ پھر ایک اور مقام پر ہے: أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الاعراف ۷: ۱۷۹) ہم کہتے ہیں کہ سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں، لیکن موت تک سب برابر نہیں ہیں۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۴۹: ۱۳) ہمارے ہاں تکریم کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ مجرم اور غیر مجرم کی تکریم برابر نہیں ہے۔ یہ ہمارے اصولوں میں ہے۔ مجرم قتل کا ہو، زنا کا ہو، کسی معاشرتی جرم کا مجرم ہو، وہ بے گناہ شخص کی طرح تکریم کا مستحق نہیں ہے، جبکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہ بے گناہ شخص کی طرح ہی تکریم کا مستحق ہے۔ اس لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ مجرم کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس سے اس کی تذلیل ہوتی ہو۔ یہ کہتے ہیں کہ انسان مجرم ہو یا غیر مجرم، تکریم میں سب برابر ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر مجرم اور غیر مجرم تکریم میں برابر ہوں گے تو جرم کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ تو پہلی شق میں یہ ہمارا جزوی تحفظ ہے۔ لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوٰی۔ (مسند احمد، رقم ۲۲۳۹۱) یعنی ہم کردار کی بنیاد پر ایک آدمی اور دوسرے آدمی کی عزت میں فرق کرتے ہیں۔ اصولاً ہمیں اس چارٹر کی پہلی شق سے اتفاق ہے لیکن اس کی بنیاد پر جو آگے تطبیقات ہوتی ہیں، ان میں ہمارا ایک تحفظ ہے کہ ہم مجرم وغیر مجرم کے لیے یکساں تکریم نہیں مانتے۔

آزادی ہر شخص کا حق ہے

دفعہ نمبر ۲:

''ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

تبصرہ:

اصولاً یہ بھی ٹھیک ہے کہ تمام حقوق سب کے لیے برابر ہیں۔ کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، امریکی ہے، افریقی ہے، تمام حقوق میں سب برابر ہیں۔ اس کے علاوہ جس علاقے یا ملک سے کوئی شخص تعلق رکھتا ہے، اس کی سیاسی کیفیت، دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنا پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ کوئی آزاد ملک میں رہتا ہے، کوئی غلام ملک میں رہتا ہے، کوئی اقوام متحدہ کے زیر تولیت ملک میں رہتا ہے، انسان تمام حقوق میں برابر ہوں گے۔

جان کی آزادی اور تحفظ

دفعہ نمبر۳:

''ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔''

تبصرہ:

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

ان دماء کم و أموالکم و اعراضکم علیکم حرام، کحرمة یومکم هذا، فی بلدکم هذا، فی شهرکم هذا (بخاری، رقم ۴۰۵۴، ٦٥٥١)

کسی شخص کی جان، مال اور عزت کسی دوسرے کے لیے حلال نہیں ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں و ابشارکم کا لفظ بھی ہے کہ کسی کا چمڑا بھی کسی دوسرے کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس دفعہ سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

غلامی کا مسئلہ

دفعہ نمبر۴:

''کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔''

تبصرہ:

اسے کہتے ہیں غلامی کا مکمل خاتمہ۔ اسے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ ہم نے غلامی کا خاتمہ کیا ہے اور آپ لوگ غلامی کے خاتمہ پر ہم سے اتفاق بھی کرتے ہیں، لیکن آپ پھر بھی اپنے اداروں میں غلامی پڑھا رہے ہیں۔ وہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے قوانین میں غلامی ختم نہیں کی۔ قرآن میں بھی غلامی پڑھا رہے ہیں: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (النساء۴: ۲۴) ایک اور جگہ پر ہے: إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ (المومنون۲۳: ۶) قرآن کریم میں بھی ہم غلامی کے مسائل پڑھاتے ہیں اور احادیث میں اور فقہ میں بھی مکاتبت، مدبیر، استیلاد وغیرہ کے مسائل پڑھاتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ ہم غلامی کے عملاً خاتمے میں تو ان کے ساتھ ہیں، لیکن ذہناً غلامی کے خاتمے سے متفق نہیں ہیں۔ یہ بات درست بھی ہے کہ ہم نے عملاً غلامی کا خاتمہ قبول کرلیا ہے۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران جہاد کے عنوان سے جتنی جنگیں ہوئی ہیں، کیا کسی جنگ میں مسلمانوں نے کسی کو غلام یا لونڈی بنایا ہے؟ کشمیر، فلسطین، افغانستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں نے کسی کو لونڈی یا غلام نہیں بنایا۔

ہمارے دینی مدارس کے نصاب پر ان کے جو اعتراضات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ مخالف کی بات سمجھنا بہت ضروری ہے اور میں آپ حضرات کے سامنے ان کے موقف کی وضاحت کر رہا ہوں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہم سے متفق بھی ہیں اور عملاً آپ ایسا کر بھی نہیں رہے تو پھر آپ اپنے مدارس میں یہ پڑھا کیوں رہے ہیں؟ ان کا ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم اپنے ان قوانین میں ترمیم کریں۔ غلامی سے متعلقہ آیات قرآن سے نکالیں۔ غلامی سے متعلقہ احادیث کے ابواب کتابوں سے نکالیں۔ فقہ کی کتابوں سے غلامی کی بحثیں نکال دیں۔ اگر آپ لوگ نکال نہیں سکتے تو کم از کم ان کو پڑھانا تو چھوڑ دیں۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی یہ تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ نہ قرآن کریم کے کسی قانون

میں رد و بدل کا ہمیں اختیار ہے اور نہ صحیح احادیث میں سے کسی کا انکار ہمارے اختیار میں ہے۔ ایک صاحب مجھ سے بات کرنے لگے کہ مولوی صاحب کچھ نہ کچھ کرنا تو پڑے گا، ورنہ ہم بین الاقوامی برادری میں کیسے ایڈجسٹ ہوں گے؟ میں نے ان صاحب کو سیدھا انکار کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ ٹھیک ہے۔ آپ ایک ایجنڈا بنالیں کہ آپ نے قرآن واحادیث میں کہاں کہاں ترامیم کرنی ہیں، بلکہ میں اقوام متحدہ کے چارٹر کو سامنے رکھتے ہوئے اس ایجنڈے کی تیاری میں آپ کی مدد بھی کر دوں گا، لیکن اس ایجنڈے پر عملدرآمد کے لیے اسے منظور کس اتھارٹی سے کروانا ہے؟ یہ کام آپ کا ہے۔ آخر کوئی اتھارٹی اسے قبول کر کے منظوری دے گی تو اس پر باقاعدہ عملدرآمد ہوگا۔ جیسے پاکستان کے دستور میں کوئی ترمیم کرنی ہو تو اس کی اتھارٹی پارلیمنٹ ہے۔ کسی جماعت کے منشور میں ترمیم کرنی ہو تو اس کی اپنی کوئی دستور ساز کمیٹی ہوتی ہے جس سے اسے منظور کروایا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ قرآن واحادیث میں جو ترامیم طے کریں گے، آخر انہیں منظور کس اتھارٹی سے کروائیں گے؟ ہمارے پاس تو اس کی کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ نہ دارالعلوم دیوبند کے پاس ہے، نہ دارالعلوم کراچی کے پاس، نہ مدینہ یونیورسٹی کے پاس ہے۔ اس دنیا میں تو کوئی اتھارٹی نہیں ہے جو یہ ترامیم منظور کر کے ان پر عملدرآمد کرا سکے۔ اب قرآن کریم میں ترمیم کی درخواست ہم اقوام متحدہ کو دینے سے تو رہے۔

وہ صاحب بالآخر کہنے لگے کہ جی اتھارٹی تو واقعی کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پھر وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟ میں یہاں وہ بات پھر دہرا دیتا ہوں کہ اگر قرآن کریم کے کسی قانون میں رد و بدل کا اختیار ہوتا تو کس کے پاس ہوتا؟ میں لو کان فیھما الھۃ کے اسلوب میں مفروضے کے درجے میں بات کر رہا ہوں۔ اللہ نے تو اپنے نبی سے کہا ہے:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ (یونس۱۰:۱۵)

''اور جب ان کو ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کا اندیشہ نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے کر آ ؤ یا اس کو تبدیل کر دو۔''

یہ تو تھا ایجنڈا، اب آگے فیصلہ ہے۔ فرمایا:

قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِيْ

''آپ کہہ دیجیے کہ مجھے تو از خود اس میں تبدیلی کا سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔''

یہ بات اللہ تعالیٰ کس سے کہلوا رہے ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اب قیامت تک جہاں اور جب بھی ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَـٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ کا مطالبہ ہوگا، اس کا یہی جواب ہوگا: قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِيْ ۔ قرآن کریم نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور آگے یہ بھی کہہ دیا کہ: إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔ میں تو بس وحی کا پابند ہوں۔ پھر قرآن نے یہاں بھی بس نہیں کی، اس کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ: إِنِّيْ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے یہ غلطی کر دی تو قیامت کے روز عذاب میں پکڑا جاؤں گا۔

بہرحال میں ان کے اعتراض پر واپس آتا ہوں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جب آپ لوگ ہمارے ساتھ اس معاہدے میں شریک ہیں، دستخط بھی کر رکھے ہیں اور عملاً بھی آپ نے غلامی کا اختتام کر رکھا ہے تو پھر آپ نظری اور علمی طور پر اس کو کیوں باقی رکھے ہوئے ہیں؟ قرآن و حدیث میں آپ یہ کتابت و مکاتبت، استیلاد و تدبیر اور یہ کفارات کے مسئلے اپنے طلبہ کو کیوں پڑھا رہے ہیں؟ اب غلامی کیا ہے اور اس پر ہمارا موقف کیا ہے؟ اس پر بات کرنے سے ان حضرات کے اعتراض کا جواب سامنے آجائے گا۔

جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانے میں کسی شخص کو غلام بنانے کے تین طریقے رائج تھے۔ ایک طریقہ تو وہ تھا جسے آج کل بردہ فروشی کہتے ہیں۔ کوئی طاقتور آدمی کسی کمزور آدمی کو پکڑتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیتا تھا۔ زید بن حارثہؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے۔ وہ کسی غلام خاندان کے فرد نہیں تھے۔ راہ چلتے کچھ طاقتور لوگوں نے انھیں پکڑا اور بیچ دیا۔ سلمان فارسیؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے۔ علم کی تلاش میں سفر کر رہے تھے، کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھ

گئے جنہوں نے غلام بنا کر انہیں بیچ دیا۔ اسے آج کی اصطلاح میں بردہ فروشی کہتے ہیں۔ آج بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی بچے، کسی بچی کو اغوا کیا اور آگے بیچ دیا۔ چنانچہ ایک طریقہ غلام بنانے کا یہ رائج تھا۔

دوسرا طریقہ غلام بننے اور بنانے کا یہ تھا، جس کا بائبل میں بھی ذکر ہے اور پرانی قوموں میں بھی یہ طریقہ رائج رہا ہے، کہ کسی آدمی نے کوئی جرم کیا ہے یا اس کے ذمے کوئی تاوان ہے تو عدالت نے، پنچایت نے، تحکیم نے، قضا نے اس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنا دیا، بلکہ بعض اوقات تو مجبور آدمی خود اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دیتا تھا۔ مثلاً کسی پر کسی کا کوئی قرض ہے جسے وہ چکا نہیں سکتا تو وہ آخر ہار مان کر کہہ دیتا تھا کہ ٹھیک ہے، میں تمہارا غلام ہوں۔ مجھے بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو یا خود مجھ سے کام لے لو۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدی جو ہاتھ میں آتے تھے، انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ جنگ کے دوران جو لوگ قید میں آ جاتے تھے، ان کے بارے میں مختلف آپشنز ہوتے تھے۔ مثلاً یہ کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا کبھی کبھار کسی حکمت کے تحت ویسے ہی چھوڑ دیا جائے یا قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ انہیں قید کر لیا جائے۔ اب جب قید کر لیا جاتا تو پھر دو صورتیں ہوتیں۔ یا تو انہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے اور یا انہیں غلام بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جیل کا قیدی یا پھر گھر کا قیدی۔ حضورؐ کے زمانے میں عرب میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھنا مشکل تھا۔ چنانچہ یہ قیدی خادم کے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

یہ تین طریقے اس وقت غلام بنانے کے رائج تھے۔ ان میں سے دو صورتیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر منع فرما دیں۔ آپ نے بردہ فروشی کو حرام قرار دے دیا اور جرمانے یا تاوان میں بھی کسی کو غلام بنانے کو حرام قرار دے دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کے خلاف میں قیامت کے دن خود مدعی بنوں گا۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت کھا جائے: ورجل باع حرا فاکل ثمنہ۔ (بخاری، رقم ۲۱۱۴)

امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں

یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی کو ختم کر دیا، ان کے ہاں تو ابھی ایک سو سال پہلے تک غلامی رائج رہی ہے۔ امریکہ میں، جو آج دنیا کا بڑا چودھری ہے، افریقہ سے بحری جہاز بھر بھر کر انسانوں کو لایا جاتا تھا اور امریکہ کی منڈیوں میں لا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ آج سے سو سال پہلے تک امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں موجود تھیں۔ آزاد آدمی پکڑ کر لائے جاتے تھے اور منڈیوں میں بیچ دیے جاتے تھے۔ امریکہ میں گزشتہ صدی تک غلامی کے جواز عدم جواز کی بحث چلتی رہی ہے۔ گزشتہ صدی میں امریکہ میں جو شمال و جنوب کی جنگ ہوئی ہے، میں نے اٹلانٹا کا وہ میدان دیکھا ہے جہاں آخری جنگ ہوئی اور جنرل رابرٹ ایڈورڈ لی (Robert E. Lee) نے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس جنگ کے دور میں امریکہ کے دانشوروں نے کتابوں کی کتابیں لکھیں جو غلامی کے جواز پر دلائل سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ابھی گزشتہ صدی کی بات ہے اور آج امریکہ آزادی کا ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

امریکہ میں رہنے والے افریقی نسل کے لوگوں کو ۱۹۶۴ء تک ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا۔ کونڈو لیزا رائس امریکہ کی وزیر خارجہ رہی ہے۔ امریکہ میں وزیر خارجہ کو تقریباً وزیر اعظم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ صدر کے بعد دوسری بڑی شخصیت وزیر خارجہ کی ہوتی ہے۔ یہ کونڈو لیزا رائس صرف سیاست دان نہیں بلکہ یہ مغرب کے چند بڑے دانش وروں میں سے ایک ہے۔ میں نے اس کا شہر بھی دیکھا ہے اور اس کا گھر بھی دیکھا ہوا ہے۔ اس عورت کا باپ ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ووٹ کا حق لینے کے لیے امریکہ میں عدالتی جنگ لڑی۔ اس کے باپ کو ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا، اس لیے کہ وہ افریقی النسل کالا تھا۔ اس نے ایک طویل عدالتی جنگ لڑی کہ ہم لوگ بھی امریکہ کے شہری ہیں، ہمیں ووٹ کا حق کیوں حاصل نہیں ہے! میں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس بات کو ابھی آدھی صدی بھی نہیں گزری اور یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی ختم کی ہے، جبکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ غلامی سب سے پہلے اسلام نے ختم کی ہے۔ بردہ فروشی اور بطور تاوان کے غلام بنانے کو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ختم کر دیا تھا اور غلامی کی صرف تیسری صورت باقی رہ گئی تھی۔

غلامی کے بارے میں ہمارا موقف

یہاں پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا اسلام نے غلام بنانے کا حکم دیا ہے یا غلامی کی جو تین صورتیں رائج تھیں، ان میں سے دو کو ختم کر کے ایک صورت کو بطور آپشن کے باقی رکھنے کی اجازت دی ہے؟ یعنی جنگی قیدی اگر آپ کے ہاتھ میں آ گیا ہے تو کیا اسے غلام بنانا ضروری ہے یا آپ کی مرضی ہے کہ اس سے کس طرح سے فائدہ اٹھائیں؟ سزائے موت دے دیں، اپنے کسی قیدی کے ساتھ تبادلہ کر لیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیں، ویسے ہی رضا کارانہ چھوڑ دیں، قید خانے میں ڈال دیں یا اس سے ایسا کام لے لیں جو اس کے بس سے باہر کا نہ ہو۔ سورۂ محمد میں اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ:

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد ۴۷: ۴)

”پھر یا اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ کا زور بالکل ٹوٹ جائے۔“

گویا اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانا فرائض، واجبات یا مستحبات میں سے نہیں ہے۔ یہ تو مباحات میں سے ہے اور ایسا کوئی بین الاقوامی معاہدہ قبول کرنا جس سے کسی مباح پر اثر پڑے تو اس کے لیے اس مباح کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ ہم نے غلامی کی ایک صورت کو اس زمانے کے عرف کے حوالے سے قبول کیا تھا اور آج کے عرف کے حوالے سے اس ایک صورت سے بھی ہم نے عملاً دستبرداری اختیار کر لی ہے۔ البتہ ایک بات سمجھنے کی ہے۔ ایسا ہم نے اصولاً نہیں بلکہ عملاً کیا ہے۔ خدانخواستہ غلامی کے ایسے حالات دنیا میں پھر پیدا ہو جائیں تو ہم ان حالات سے نمٹنے کا راستہ کیوں بند کریں؟ اصولاً ہم اپنے موقف پر قائم ہیں۔ قرآن وسنت کی تعلیمات اصولاً اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہم احکام سے دستبردار نہیں ہوئے بلکہ تطبیق سے دستبردار ہوئے ہیں۔

ایک مزید بات سمجھنے کی ہے۔ میرا مغرب سے سوال ہے کہ تم اپنے عرف کو دائمی اور حتمی عرف کیسے کہہ دیتے ہو؟ آیا عرف کبھی دائمی رہا ہے؟ تعامل کبھی ابدی رہا ہے؟ یہ تو بدلتا رہتا ہے۔ ایک

بات میں پھر عرض کرتا چلوں کہ جہاں ہمارے احکامِ صریحہ، نص قطعی اور نص صریح متاثر نہ ہوتے ہوں، وہاں ہم بین الاقوامی معاہدات کو قبول بھی کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ہاں، جہاں ہمارے احکامِ منصوصہ متاثر ہوں گے، وہاں ہمیں ضرور اعتراض ہوگا۔ ہم تو آج خود مطالبہ کرتے ہیں کہ گوانتانا موجزیرے کے قیدیوں سے بین الاقوامی معاہدات اور جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک کیا جائے۔

اب اس امکان کی نفی تو نہیں کی جاسکتی کہ کبھی ایسا دور پھر واپس آجائے جس کی یہ لوگ ہمیں دھمکیاں بھی دیتے ہیں کہ ہم تمہیں پتھر کے دور میں واپس بھیج دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ پتھر کا دور پھر واپس آجائے۔ امکانات کو یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دنیا میں ایسا دور، ایسے حالات دوبارہ آجائیں کہ غلامی کی یہ صورت رائج ہو جائے تو ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس احکامات موجود ہیں، ان احکامات سے ہم دستبردار نہیں ہوئے، وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ چنانچہ میرا مغرب کے دانشوروں سے ایک سادہ سا سوال ہے۔ فرض کریں، ہم پتھر کے دور میں واپس چلے گئے ہیں اور کسی جنگ میں کچھ قیدی ہمارے ہاتھ آگئے ہیں۔ ان قیدیوں کو ہم اپنی سیاسی اور جنگی حکمت عملی کے تحت نہ آزاد کر سکتے ہیں، نہ کسی قسم کے تبادلے میں چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہم انھیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمارے پاس دو صورتیں ہیں۔ یا تو انہیں اجتماعی طور پر کسی قید خانے میں ڈال دیا جائے اور یا پھر انہیں مختلف خاندانوں کے حوالے کر دیا جائے۔

یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس قیدی کے لیے ان میں سے بہتر صورت کون سی ہے؟ قید کی کوئی مدت بھی معین نہیں ہے۔ آپ اس قیدی سے پوچھیں کہ وہ جیل میں رہنا چاہتا ہے یا کسی کے ساتھ گھر میں؟ مکمل غلامی چاہتا ہے یا نیم آزادی؟ قیدی سے پوچھیے کہ وہ حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا پھر بس جیل میں پڑا گلنا سڑنا چاہتا ہے؟ آج کل کی جیلیں آپ دیکھ لیں۔ ایک قیدی ایک لمبی قید گزار رہا ہے۔ جب وہ اپنی قید کا ایک بڑا عرصہ گزار لیتا ہے تو اسے ضمانت پر کسی زمیندار کے پاس یا کسی رفاہی ادارے کی خدمت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ

اپنی قید کا باقی عرصہ گزارتا ہے۔ آپ اس قیدی سے پوچھیے کہ اس کے لیے وہ جیل کی چاردیواری بہتر تھی یا نیم آزادی کے ساتھ خدمت بہتر ہے؟ ایک عورت کے لیے جیل میں سڑنا بہتر ہے یا حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا بہتر ہے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام نے غلامی کی تین قسموں میں سے ایک قسم کی اجازت دی ہے اور اس قسم پر بھی عمل کی نوبت بہت سے آپشنز کے بعد آتی ہے کہ جب ایک جنگی قیدی کو فدیہ لے کر نہ چھوڑنا ہو، قیدی کے تبادلے میں رہا نہ کرنا ہو، سزائے موت نہ دینی ہو تو ایسی صورت میں اسے قید میں ڈال کر اس کی زندگی کو بالکل ہی بے مقصد بنانے کے بجائے اسے حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ میں پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ایسی صورت میں قیدی کا بہترین مفاد اس میں ہے کہ اسے جیل میں ڈالنے کی بجائے کسی کا غلام بنا دیا جائے جہاں اسے زندگی کے کچھ نہ کچھ حقوق میسر ہوں۔ اب یہ بات اس کے بعد کی ہے کہ اسلام نے اس غلام کے ساتھ حسن سلوک پر کس طرح ابھارا ہے اور اس سے بدسلوکی پر کیسی مذمت کی ہے۔

اہل مغرب کا اعتراض یہ ہے کہ اگر آپ لوگ غلامی کے خاتمے پر عملاً متفق ہیں تو پھر آپ لوگ اپنے نصاب میں غلامی پڑھاتے کیوں ہیں، غلامی کا ذکر کیوں کرتے ہیں اور غلامی سے متعلق قرآن وسنت کے احکام کو منسوخ کیوں نہیں کرتے؟ چارٹر کی شق اس طرح سے ہے کہ "کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دے دی جائے گی۔" اس کے جواب میں، میں نے جو عرض کیا، اس کا خلاصہ عرض کر دیتا ہوں کہ غلامی کی تین میں سے دو صورتیں تو ہم نے آپ لوگوں سے بارہ سو سال پہلے ختم کر دی تھیں۔ ہمارے ختم کرنے کے بعد بھی آپ لوگ بارہ سو سال تک بردہ فروشی کرتے رہے ہیں۔ تاوان اور سزا میں غلام بنانے کو بھی اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ختم کر دیا تھا۔ تاہم تیسری قسم یعنی جنگی قیدیوں کو بطور غلام رکھنے کا اسلام نے حکم نہیں دیا، بلکہ ایک آپشن کے طور پر اس صورت کو باقی رکھنے کی اجازت دی ہے اور ہم اپنے قوانین کی روشنی میں قیدی کے لیے، ایسے حالات میں جب اسے چھوڑنا قومی وملکی مفاد میں نہ ہو، دوسرے آپشن یعنی جیل میں ڈال دینے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

اس وقت غلامی کے حوالے سے جو عالمی عرف ہے، ہم نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا ہے۔ ہم تو کسی جنگ میں بھی کوئی غلام نہیں بنا رہے، بلکہ ایک لطیفے کی بات ذکر کرتا چلوں۔ روسی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کے دوران میں مجھے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کو جہاد سے کوئی لونڈی ملی ہے؟ میں نے کہا نہیں بھئی، ہم بین الاقوامی معاہدے کے پابند ہیں، اس لیے کہ غلام اور لونڈی بنانا اسلام میں فرائض میں سے نہیں ہے، بلکہ مباحات میں سے ہے اور خاص حالات میں صرف ایک اجازت کی حد تک ہے۔ یہاں پھر یہ بات واضح کرتا چلوں کہ قرآن و احادیث کے منصوصات کو تبدیل کرنے کی اتھارٹی نہ ہم خود رکھتے ہیں اور نہ کسی اور کی مانتے ہیں۔

اسلام میں جرم وسزا کے قوانین

دفعہ نمبر ۵:

"کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔"

تبصرہ:

اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے جس میں جسمانی اذیت ہو یا تذلیل ہو اور کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس میں جسمانی تشدد ہو اور اس کی تذلیل ہو۔

آیئے، اس دفعہ کے مضمرات پر غور کریں۔

اسلام میں سزاؤں کا نظام تین حصوں میں ہے: قصاص، حدود اور تعزیرات۔

قصاص کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۵:۴۵)

اس میں جسمانی تشدد بھی ہے اور تذلیل بھی ہے۔

حدود کی سزاؤں میں رجم کی سزا ہے۔ اب رجم تو نام ہی تشدد کا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کی

سزاؤں میں بھی تشدد ہے۔تعزیرات میں کوڑے مارنے کی سزائیں ہیں۔ان میں بھی تشدد ہے۔ اور پھر وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور۲۴: ۲) کا حکم بھی ہے۔اب برسر عام سزا دینے میں تذلیل بھی ہے۔یعنی اسلامی سزاؤں کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچتا جو اقوام متحدہ کے چارٹر کی زد میں نہ آتا ہو۔اخبارات میں یہ جملے تو اکثر آپ حضرات پڑھتے ہوں گے کہ یہ غیر انسانی، ظالمانہ اور وحشیانہ سزائیں ہیں۔ان جملوں کے پیچھے دراصل یہ دفعہ بول رہی ہوتی ہے۔ اب تو پاکستان سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ قصاص میں قتل کی سزا بھی ختم کی جائے۔حال ہی میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد منظور ہوئی ہے کہ موت کی سزا کسی بھی جرم میں نہ دی جائے۔ ہمارے ہاں موت کی سزا قصاص، ارتداد، محاربہ، قطع طریق اور بغاوت وغیرہ میں دی جاتی ہے۔ جنرل اسمبلی نے بھاری اکثریت سے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ سزائے موت کا قانون پوری دنیا سے ختم ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے پوری دنیا میں ایک مہم چل رہی ہے۔ظاہر ہے پاکستان بھی دنیا سے باہر نہیں ہے، ہم سے بھی یہ مطالبہ ہے کہ سزائے موت ختم کردی جائے۔دیگر قوانین تو آہستہ آہستہ ختم ہو ہی رہے ہیں، جیسا کہ کوڑوں کی سزائیں ختم کر کے پانچ سال قید کی سزا رکھ دی گئی ہے، اس لیے کہ دنیا والے کہتے ہیں کہ آپ اتنے معزز اور مکرم آدمی کو سرعام کوڑے کیوں مارتے ہیں؟ اب اس دفعہ کا یہ چھوٹا سا جملہ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس میں انہوں نے اسلام کے سزاؤں کے سارے نظام کو لپیٹ دیا ہے۔ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو سمجھ بھی نہیں پاتے اور وہ اپنا سارا کام کر گزرتے ہیں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ یہ جو آپ کی قصاص، حدود اور تعزیرات وغیرہ کی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے اور انہیں غیر انسانی اور وحشیانہ قرار دیا جاتا ہے، یہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی اس دفعہ نمبر ۵ کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔اس سلسلے میں آپ سے مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپ نے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے اور کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دیں گے تو پھر آپ ایسی سزائیں کیوں نافذ کرتے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹے جاتے ہیں، کوڑے لگائے جاتے ہیں اور سب کے سامنے مجرم کی تذلیل کی جاتی ہے؟

اسلام اور بین الاقوامی عرف

ہمارے ہاں سپریم کورٹ میں ایک بحث چلی تھی۔ چکوال کا ایک ڈکیتی کا مقدمہ تھا۔ ایک آدمی نے قتل بھی کیا تھا اور ڈاکہ بھی ڈالا تھا۔ چکوال کی ایک خصوصی عدالت نے اس کیس میں فیصلہ سنایا کہ اس آدمی کو برسر عام پھانسی دی جائے گی۔ اس فیصلے کا سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لے لیا۔ سپریم کورٹ میں یہ بات زیر بحث آ گئی کہ کسی مجرم کو برسر عام سزا دینے میں تذلیل پائی جاتی ہے۔ تذلیل عزت نفس کے منافی ہے اور عزت نفس انسانی حقوق میں شامل ہے۔ چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرل اور وفاقی اٹارنی جنرل بحث میں شریک ہوئے۔ ایس ایم ظفر ہمارے دوست ہیں، بہت بڑے وکیل ہیں، وہ بھی پیش ہوئے۔ اس بحث میں وکلا کا موقف تھا کہ برسر عام سزائیں نہیں ہونی چاہئیں اور اس موقف کی حمایت میں انہوں نے دو دلیلیں پیش کیں۔ ایک دلیل یہ کہ قرآن میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدہ ۵:۱) یعنی قرآن کریم ہمیں معاہدات کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ دوسری دلیل یہ دی کہ قرآن کریم معاملات میں ہمیں عرف کی پابندی کی تلقین کرتا ہے، جبکہ یہ آج کا عالمی عرف ہے، لہٰذا ہم اس بات کے پابند ہیں کہ ہم اپنے قانونی نظام میں اس بات کی پابندی کریں۔

میں نے پہلے یہ بات واضح کی تھی کہ ہمیں بین الاقوامی معاہدات سے انکار نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے ایک حد فاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم نصوص صریحہ اور احکام قطعیہ کے حوالے سے نہ عالمی عرف کو مانتے ہیں اور نہ معاہدات کو مانتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ہر معاملے میں عرف کو بھی مان سکتے ہیں اور معاہدات کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔ غلامی کے معاملے میں ہم نے عرف کو قبول کر لیا ہے، کیونکہ وہ منصوصات میں سے نہیں ہے، لیکن قصاص، حدود اور تعزیرات کے معاملے میں ہم عرف کو قبول نہیں کرتے، کیونکہ یہ احکام قطعیہ ہیں اور ان میں ہمارے لیے کوئی عرف یا معاہدہ قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

بہر حال سپریم کورٹ میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ چونکہ قرآن کریم معاہدات کی پابندی کا اور بین الاقوامی عرف کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لیے ہمارے لیے اپنے قانونی نظام میں ان

باتوں کی پابندی لازم ہے۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے یہ آرڈر جاری کیا کہ ہمارے لیے اپنے قانونی نظام میں اقوام متحدہ کے چارٹر کی اس دفعہ کی پابندی لازم ہے۔ یوں برسرعام سزا دینے کا وہ فیصلہ سپریم کورٹ نے منسوخ کر دیا۔

ہمارے ہاں قانونی نظام میں سب سے زیادہ سنگین سزا موت کی ہے اور یہ سزا صبح سحری کے وقت جیل میں دی جاتی ہے۔ قانون کے مطابق اس سزا کے وقت سپرنٹنڈنٹ جیل، مجسٹریٹ، ڈاکٹر اور پھانسی کا لیور کھینچنے والا جلاد، ان چار آدمیوں کے علاوہ کسی پانچویں آدمی کی موجودگی ممنوع ہے اور اس کا پس منظر یہی ہے کہ یہ ایک سنگین سزا ہے، اس لیے مجرم کی تذلیل نہیں ہونی چاہیے اور بس وہی لوگ وہاں موجود ہونے چاہئیں جن کی موجودگی بامر مجبوری ضروری ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے اس ایک جملے کی زد میں حدود و تعزیرات کے قوانین کا سارا نظام آ گیا ہے اور اگر ہم دفعہ نمبر ۵ کو من و عن قبول کر لیں، عملاً تو ہم نے قبول کیا ہوا ہے، لیکن اگر ہم عقیدے اور اصول کے طور پر بھی اسے قبول کر لیں تو ہمیں اپنے پورے تعزیراتی نظام سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

اسلام کا خاندانی نظام

اس سے پہلے کہ میں اس حوالے سے اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۱۶ کا ذکر کروں، پہلے آپ خاندانی زندگی سے متعلق اصطلاحات سمجھ لیں۔ قانون کی دنیا میں چند اصطلاحات ہیں، جیسے فوجداری قوانین، دیوانی قوانین اور عائلی قوانین۔ فوجداری قوانین لڑائی جھگڑوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین میں حکومت فریق ہوتی ہے، کیونکہ ان معاملات کا تعلق امن عامہ سے ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں حکومت کسی کو بغیر کسی اطلاع یا شکایت کے پکڑ سکتی ہے۔ دیوانی قوانین وہ ہوتے ہیں جن میں آپس کی شکایات پر مقدمات درج ہوتے ہیں۔ ان میں اجتماعی امن عامہ تو زد میں نہیں آتا، لیکن لوگوں کے باہمی معاملات کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ جیسے ایک شخص کو کسی دوسرے شخص سے شکایت ہے کہ اس نے مجھ سے فلاں زیادتی یا ناانصافی کی ہے۔ ایسے معاملات میں حکومت کا خود سے کوئی دردِ سر نہیں ہوتا۔ آپ کے ساتھ کسی نے ناانصافی یا ظلم کیا ہے تو آپ کو

خود شکایت کرنا ہوگی۔ آپ شکایت نہیں کریں گے تو حکومت آپ کے معاملے میں خود سے کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی۔

پبلک لا (Public Law) اور پرسنل لا (Personal Law) کی اصطلاحات بھی ہمارے ہاں استعمال ہوتی ہیں۔ پرسنل لا کہتے ہیں خاندانی نظام کو۔ اس کو القوانین الشخصیہ، شخصی قوانین، عائلی قوانین وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت، ولایت، کفاءت وغیرہ سب اسی کے تحت آتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عیسائیوں کو ان کے پرسنل لا پر عمل کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح طلاق، حضانت، وراثت اور بچوں کی کفالت وغیرہ کے ان کے اپنے قوانین ہیں اور اس پر عمل کا حق ان کو حاصل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد علماء کرام نے جب اسلامی ریاست کے خط و خال واضح کرنے کے لیے ۲۲ دستوری نکات پیش کیے تو ان میں یہ تسلیم کیا کہ ہم اقلیتوں کو ان کے پرسنل لا پر عمل کا حق دیں گے۔ بالکل یہی حق ہم برطانیہ میں مسلمانوں کے لیے مانگ رہے ہیں۔ برطانیہ کے مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت وغیرہ کے معاملات ان کے اپنے قوانین کے مطابق طے ہوں۔ اب یہاں مغرب کا دوہرا معیار سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اقلیتوں کو ان کے پرسنل لا کے مطابق معاملات طے کرنے کا حق دیا جائے، لیکن جب یہی حق ہم مسلمان ان سے برطانیہ میں مانگتے ہیں تو وہاں وہ ہمیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ابھی کچھ عرصہ قبل پروٹسٹنٹ فرقے کے بڑے سربراہ ڈاکٹر روون ولیمز نے مسلمانوں کے حق میں کچھ بیانات دیے ہیں جن پر برطانیہ میں کچھ تنازع چل رہا ہے۔ انھوں نے ایک لیکچر میں کہا کہ مسلمانوں کو برطانیہ میں مالیات، نکاح و طلاق کے معاملے میں اپنے شرعی قوانین پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ اپنے عدالتی نظام میں یہ گنجائش پیدا کرے کہ مسلمانوں کو ان کے خاندانی اور مالیاتی معاملات اور تنازعات میں ان کے شرعی قوانین کے مطابق ان کے شرعی قاضیوں کے ذریعے فیصلوں کی سہولت حاصل ہو۔ مسلمانوں کے لیے شرعی عدالتیں قائم کرے اور شرعی قوانین نافذ کرے۔ شرعی عدالتیں پاکستان میں قائم ہوں یا نہ ہوں، لیکن عیسائی

فرقے کے سربراہ نے برطانیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے شرعی عدالتیں قائم کی جائیں، شرعی قوانین نفاذ کیے جائیں اور انہیں اپنے قوانین پر عمل کرنے کا حق دیا جائے۔ لیکن صرف دو معاملوں میں: ایک خاندانی قوانین (personal laws) یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے معاملات میں اور دوسرا حلال و حرام کے معاملات میں اس کے اس مطالبہ پر اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا ہے۔ اس سے استعفا کا مطالبہ کیا گیا ہے، لیکن وہ ڈٹا ہوا ہے کہ نہ تو میں بیان واپس لوں گا اور نہ ہی اپنے عہدے سے استعفا دوں گا۔ ڈاکٹر روون ولیمز کے اس مطالبہ کے ردعمل میں برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن کے ترجمان نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور ایسا اس لیے نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کے شرعی قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں ذرا آگے جا کر مناسب وقت میں کروں گا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے اور اس کی یہ بات غلط کیوں ہے۔ بہرحال یہ عیسائی سربراہ اور برطانیہ کے حکومتی حلقوں میں ایک کشمکش چل رہی ہے۔

برطانیہ کے برعکس امریکہ میں مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے اور وہاں چند ایک شہروں میں اکا دکا شرعی عدالتیں بھی ہیں، لیکن اجتماعی طور پر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہے۔ یہودیوں کو بھی اپنے پرسنل لا پر عمل درآمد کا حق حاصل ہے اور وہ یہ حق استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال امریکہ کے دستور میں یہ سہولت موجود ہے کہ آپ مالیاتی معاملات میں اور شخصی معاملات میں اپنے قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنی عدالتیں رجسٹر کروا سکتے ہیں جس کی رو سے آپ کے فیصلے نافذ ہوں گے، جبکہ برطانیہ میں ابھی یہ حق ہمیں حاصل نہیں ہے۔

ہمارے جو اپنے شخصی قوانین اور اصول ضابطے ہیں نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت، کفاءت وغیرہ سے متعلق، ان سب پر آج کی دنیا کو اعتراض ہے۔ ان اعتراضات کی وجہ یہ دفعہ نمبر ۱۶ ہے۔ آیئے، اب یہ دفعہ دیکھتے ہیں۔ اس دفعہ کی تین شقیں ہیں:

○ ''بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے، شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔''

o ''نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہوگا۔''

o ''خاندان معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حق دار ہے۔''

تبصرہ:

پہلی بات تو یہ قانون یہ تسلیم کرتا ہے کہ نکاح صرف بالغ مرد اور عورت کا تصور کیا جائے گا۔ صغیر اور صغیرہ کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ملک کے قانون میں بھی نکاح کے لیے لڑکی کی کم از کم عمر ۱۶ سال اور لڑکے کی کم از کم عمر ۱۸ سال مقرر ہے۔ اگر آپ اس سے کم عمر کے لڑکے یا لڑکی کا نکاح پڑھائیں گے تو قانون اسے جرم تصور کرے گا۔ عائلی قوانین کی رو سے یہ جرم ہے۔ لوگ اس پر زیادہ عمل نہیں کرتے، لیکن قانون میں بہر حال یہ ہے۔ مثلاً اگر کسی مولوی صاحب نے سولہ سال سے کم لڑکی یا اٹھارہ سال سے کم لڑکے کا نکاح پڑھا دیا اور کسی نے اس کی شکایت کر دی تو لڑکا اور لڑکی کے علاوہ مولوی صاحب بھی گرفتار ہو جائیں گے۔ اس جرم کی سزا تین مہینے قید بتائی جاتی ہے۔ نکاح کے علاوہ جو کچھ بھی ہو، اسے قانون درست تسلیم کرتا ہے لیکن نکاح اس سے کم عمر میں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر یہ شق ہم قبول کر لیں تو صغیرہ اور صغیر کے نکاح کے متعلق ان تمام قوانین سے ہم ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جو ہماری فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

یہ شق دوسری بات یہ کہتی ہے کہ ہر بالغ مرد اور عورت کو آپس میں شادی کا حق حاصل ہے، لیکن بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کے نام پر لگائی جائے۔ کوئی امریکی آسٹریلیا کی کسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی چینی کسی روسی سے شادی کرنا چاہے تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ کوئی کالا کسی گوری سے شادی کرنا چاہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کوئی مسلمان کسی ہندو یا کسی یہودی سے شادی کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی سکھ کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو کوئی پابندی نہیں۔ مذہب، نسل، قومیت، ان تینوں میں سے کسی کی بنیاد پر بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

ان تینوں میں سے دو کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نسل یا قومیت کی بنیاد پر نکاح میں ہمارے ہاں

بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی روسی مسلمان بوسنیا کی کسی مسلمان خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ہم مذہب کا فرق مانتے ہیں۔ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔ مسلمان مرد کسی غیر کتابی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتا۔ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكَاتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ اور لَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا (البقرہ۲:۲۲۱) یہ نص قطعی اور نص صریح ہے۔ مسلمان عورت تو کسی غیر مسلم مرد سے کسی صورت شادی کر ہی نہیں سکتی، البتہ مسلمان مرد غیر مسلم کتابیہ سے شادی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مذہب کی بنیاد پر نکاح کی جو پابندی ہے، آج کی دنیا کے لیے یہ ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اس پر بڑے تنازعات ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک محترمہ ہیں جو انسانی حقوق کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ عاصمہ جہانگیر ان کا نام ہے۔ اس خاتون کا خاوند قادیانی ہے۔ خود کو وہ مسلمان کہتی ہے۔ اس کے والد ملک غلام جیلانی مرحوم ہمارے ملک کے معروف لیڈروں میں سے تھے اور مسلمان تھے۔ یہ خاتون کہتی ہے کہ میں خود تو مسلمان ہوں، لیکن میرا خاوند قادیانی ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتی ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا خاوند کافر ہے۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن تھے اور ان کے بذلہ سنجی کے واقعات چلتے رہتے تھے۔ مولانا کا اپنا ایک مزاج تھا بات کرنے کا۔ ایک دفعہ اسمبلی میں ایک خاتون کھڑی ہوگئی اور کہا کہ مولوی صاحب! مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے، عورت کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ یہ تو مساوات کے خلاف ہے۔ مولانا نے جواب دیا، بھئی آپ چاہیں تو دس شادیاں کریں، آپ کو تو ہم نہیں روک رہے۔ یہ قانون تو مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس پر مولانا نے ایک پبلک جلسہ میں ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک نواب صاحب تھے۔ انہیں ایک مسئلہ درپیش ہوا تو انہوں نے علما سے رجوع کیا کہ میں پانچویں شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ کوئی جزئیہ تلاش کریں جس سے مجھے اس کی اجازت مل جائے۔ آپ نے کسی بات کی اجازت دینی ہو تو پھر جزئیہ بھی آپ کہیں سے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ میں اس کا فتویٰ دیتا ہوں، تمہارے لیے

پانچویں شادی کی اجازت ہے۔ اس پر شور مچ گیا کہ فلاں مولوی صاحب نواب صاحب کو پانچویں شادی کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس پر باقی علما نے ان مولوی صاحب کو مناظرے کا چیلنج کر دیا کہ پانچویں شادی بالکل جائز نہیں ہے۔ ان مولوی صاحب نے بھی چیلنج قبول کر لیا۔ نواب صاحب بہت خوش کہ یہ تو بہت تگڑا مولوی ہے۔ چنانچہ مناظرے کا دربار لگ گیا۔ باقی علما اور ان کے ساتھی کتابوں کے ڈھیر کے ساتھ آ گئے جبکہ یہ مولوی صاحب بالکل خالی ہاتھ وہاں پہنچ گئے۔ جب مولوی صاحب سے دلیل مانگی گئی تو انہوں نے اپنے حق میں دلیل دی کہ یہ قرآن میں مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء ۴: ۳) کی پابندی تو مسلمانوں کے لیے ہے۔ آپ حضرات کے خیال میں یہ نواب صاحب پانچویں شادی کی اجازت مانگ کر بھی مسلمان رہیں گے؟ اب جب وہ مسلمان نہیں رہیں گے تو چاہے دس شادیاں کریں۔ نواب صاحب پانی پانی ہو گئے کہ ان مولوی صاحب نے تو بیڑا ہی غرق کر دیا۔

شادی میں مذہب کی شرط

بہرحال یہ تو لطیفے کی بات تھی۔ یہ سوال ہمارے ہاں اتنا نہیں ہوتا، لیکن یورپ وغیرہ اور خاص طور پر انڈیا میں بہت اٹھایا جاتا ہے۔ یورپ وغیرہ میں تو ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان پاکستانی، انڈین، بنگلہ دیشی لڑکیاں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بیاہ کر کے چلی جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو قانون تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں الحمدللہ ابھی تک عدالتیں ایسی شادیاں قبول نہیں کرتیں جن میں لڑکی مسلمان ہو اور لڑکا غیر مسلم، لیکن یورپ وغیرہ میں بہرحال ایسا نہیں ہے۔ انڈیا میں یہ بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں پر اعتراض ہے کہ باقی سارے مذاہب کے لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں، تم لوگ الگ کیوں ہو؟ اس بنیاد پر مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ تم قومی برادری میں ایڈجسٹ نہیں ہو رہے، نہ رشتہ دیتے ہو اور نہ لیتے ہو، تم اپنے آپ کو انڈین سوسائٹی سے الگ رکھے ہوئے ہو۔ وہاں یہ معاملہ سپریم کورٹ تک جا چکا ہے اور اس پر آئین میں ترمیم تک کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن الحمدللہ وہاں کے مسلمان ڈٹے ہوئے ہیں، بلکہ ہم لوگوں سے زیادہ ڈٹے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی اس دفعہ نمبر ۱۶ کو ہم اگر عقیدے اور اصول کے طور پر قبول کر لیں تو قرآن وسنت کی نص صریح اور نص قطعی متاثر ہوتی ہے۔

اب پہلی شق کی تیسری بات پر نظر ڈالتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی قائم کرنے اور نکاح کو فسخ کرنے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اگر ہم مسلمان دفعہ نمبر ۱۶ کی اس شق کو قبول کر لیں تو ولایت، خواہ اجباری ہو یا غیر اجباری، ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ولایت بھی ہے اور کفاءت بھی ہے۔ نکاح کرنے میں بالغ لڑکے اور بالغ لڑکی، دونوں کے حقوق برابر ہونے میں ہمارے ہاں فقہا میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک بالغہ پر ولی کی ولایت غیر اجباری اور صغیرہ پر اجباری ہے، جبکہ باقی فقہا بالغہ پر بھی ولی کی ولایت کو اجباری کہتے ہیں۔ ان کے ہاں بالغہ لڑکی کا نکاح بھی ولی کرے گا۔ احناف کے ہاں بالغہ لڑکی اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسی پر ہماری عدالتیں فیصلے دے رہی ہیں۔ ہمارے ہاں آج کل لڑکیاں گھر سے فرار ہو کر چلی جاتی ہیں اور اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہیں اور پھر ان کے ماں باپ عدالت میں مقدمہ لے کر آتے ہیں کہ فلاں نے ہماری بیٹی کو ورغلایا اور بھگا کر لے گیا۔ اس پر عدالت میں وہ لڑکا لڑکی بھی پیش ہوتے ہیں اور آ کر کہتے ہیں کہ ہم نے تو شادی کی ہے۔ اب عدالت اس شادی کو قبول کر لیتی ہے اور ماں باپ سے کہتی ہے کہ آپ کی چھٹی، آپ اپنے گھر جائیے اور یہ لوگ اپنے گھر جائیں گے۔ عدالتیں یہ فیصلے احناف کے اس موقف کے حوالہ سے دیتی ہیں کہ بالغ لڑکی اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔

گزشتہ دنوں ایک واقعہ ہوا کہ ایک لڑکی گھر سے نکل گئی۔ ایک دو مہینے مختلف ہوٹلوں وغیرہ میں لڑکے کے ساتھ رہی۔ ماں باپ نے عدالت میں شکایت کی۔ اس پر وہ لڑکا لڑکی بھی عدالت میں پیش ہوئے اور کہا کہ ہم نے تو شادی کر لی ہے۔ عدالت نے ماں باپ سے کہا کہ بھئی، آپ اپنا کام کریں، یہ تو میاں بیوی ہیں۔ فیصلہ اسی حوالے سے تھا کہ چونکہ امام ابو حنیفہؒ یہ موقف رکھتے تھے، اس لیے اس کی رو سے لڑکی کو اپنی مرضی سے شادی کا حق حاصل تھا۔ اس پر میں نے جج کو ایک مضمون میں لکھا کہ کیا امام صاحب کا صرف ایک ہی قول تمہیں ملا ہے؟ امام صاحب نے باقی جو

کچھ کہا ہوا ہے، وہ تمہاری نظر سے کیسے چھپا رہ گیا؟ میں نے کہا کہ مقدمے کے ریکارڈ کے مطابق لڑکی گھر سے از خود نکل کر گئی ہے۔ ایک دو مہینے اس لڑکے کے ساتھ ہوٹلوں میں رنگ رلیاں مناتی رہی ہے اور اس کے بعد نکاح ہوا ہے۔ اس معاملے میں بھی امام ابو حنیفہؒ کچھ کہتے ہیں یا نہیں؟ اس کا تم نے کیا نوٹس لیا ہے؟ تمہیں صرف آخر میں جا کر ہی فقہ حنفی یاد آئی ہے؟

یہ لوگ امام صاحب کے قول کے حوالے سے جو یہ فیصلہ دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام صاحب ان کے لیے کوئی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اس سے ان کو گنجائش ملتی ہے۔

لاہور کا ایک مشہور کیس تھا، صائمہ کیس۔ ایک روپڑی خاندان ہے جو اہل حدیث علما کا خاندان ہے۔ ان کی ایک بالغ لڑکی کالج میں ایک لڑکے کے ساتھ نکل گئی اور شادی کر لی۔ عدالت میں کیس آ گیا۔ بی بی سی، وائس آف امریکہ، سی این این، وائس آف جرمنی اور دنیا کے اخبارات میں اس کا چرچا ہوا کہ مولویوں کی لڑکی بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ ان لوگوں کو وہابی یا دیوبندی سے غرض نہیں ہے، ان کو تو مولوی سے غرض ہے۔ اب اہل حدیث کے ہاں شوافع کے قول کو مانا جاتا ہے کہ بالغ لڑکی کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کا حق نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے مقدمہ دائر کر دیا کہ نکاح نہیں ہوا، جبکہ بعض حنفی علماء کرام نے اس کے مقابلہ میں عدالت میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ولایت اور کفاءت کا مسئلہ

جب یہ مقدمہ منظر عام پر آیا تو میں نے بھی اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مسئلے پر فیض الباری میں علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ نے خوب بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کے مطابق امام صاحبؒ کی طرف جو یہ موقف منسوب ہے، مطلقاً درست نہیں ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ بالغہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی اور بالغہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ولی اور کفو کا احترام کرے۔ ان دونوں باتوں کو شامل کر کے شاہ صاحب نے حنفی موقف یہ قرار دیا کہ اجتماع رضائین شرط ہے۔ ولی، بالغہ کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور بالغہ، ولی

کی مرضی کے بعد اپنی شادی نہیں کر سکتی۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ کے مطابق احناف کا اصل موقف یہ ہے کہ اجتماع رضا ئین شرط ہے۔ میں نے یہ سارا موقف تحریری صورت میں مرتب کیا اور علماء کرام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ الحمدللہ سب علماء دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث بلکہ اہل تشیع نے بھی میرا یہ موقف قبول کیا۔ سب کے مشترکہ دستخطوں سے ہائیکورٹ میں ہمارا یہ موقف داخل ہوا۔

احناف کے موقف کے حوالے سے ایک پرانا واقعہ بھی ذہن میں آ گیا۔ بریلوی دیوبندی تقسیم جب برصغیر میں شروع ہوئی ہے تو سب سے پہلی بڑی شخصیات جو دونوں طرف سے تھیں، ان میں بریلویوں کی طرف سے مولانا احمد رضا خان بریلوی اور دیوبندیوں کی طرف سے مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔ اس زمانہ میں ایک بالغہ لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لیا۔ اب احناف کے ہاں ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ اس اعتراض سے اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ آیا نفس اعتراض سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے یا قضا اور تحکیم سے ہوتا ہے؟ اس میں احناف کے ہاں دو آراہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ نفس اعتراض سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے جبکہ دوسری رائے میں یا تحکیم سے ہوگا یا قضا سے۔ اس پر ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ فتاویٰ رشیدیہ میں پڑھ لیں۔ یہ اُس دور کی بات ہے۔ مذکورہ لڑکی کی اس حرکت پر باپ نے اعتراض کر دیا کہ میری توہین ہوئی ہے، میری عزت مجروح ہوئی ہے، مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ باپ کے قبول نہ کرنے سے یہ نکاح باقی رہ گیا یا نہیں۔ فتویٰ کے لیے سوال گیا مولانا احمد رضا خان بریلوی کے پاس۔ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ نکاح ختم ہو گیا ہے۔ اب یہی سوال مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس گیا تو مولانا گنگوہی نے کہا کہ نہیں بھئی، اعتراض کا حق تو ہے، لیکن نکاح ختم ہوگا یا تحکیم سے، یا قضا سے۔ اب یہ دونوں فتوے محاکے کے لیے حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ کے پاس گئے جو کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم تھے۔ مفتی صاحب نے ایک جملہ اس میں لکھا کہ مجیب اول کا جواب درست ہے۔ مجیب اول تو مولانا احمد رضا خان بریلوی تھے جو کہ مخالف تھے، جبکہ دوسری طرف مولانا رشید احمد گنگوہی خود مولانا عزیز الرحمٰن کے استاذ تھے۔ لیکن آپ ان کی

فقہی دیانت دیکھیے کہ جس موقف کو صحیح سمجھا، وہی بیان کیا قطع نظر اس سے کہ یہ اپنے ہی استاذ کے مخالف کے حق میں جا رہا ہے۔

خیر، میں یہ بتا رہا تھا کہ دفعہ نمبر ۱۶ کو عقیدے اور اصول کے طور پر تسلیم کرنے سے نکاح کے انعقاد میں ہمارے ہاں جو ولایت، کفاءت وغیرہ کے احکامات ہیں، سب ختم ہو جاتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان اختیارات کا توازن

زیر بحث شق کا اگلا جملہ ازدواجی زندگی کے دوران میاں بیوی کے حقوق و اختیارات سے متعلق ہے۔ اسلام کا واضح قانون ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (النساء۴: ۳۴)

اس کا اولین مصداق خاندان ہے۔ عمومی مصداق میں ملک کی حکومت بھی مراد لی جاتی ہے، لیکن اولین مصداق یہی ہے کہ مرد گھر کا حاکم ہے اور لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ۲: ۲۲۸) گھر کے نظم کا حکمران مرد ہے۔ اس کی دو وجوہات بھی قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔ اس سے اس دنیا کی فضیلت مراد ہے کہ اللہ نے مرد کی عقلی و جسمانی ساخت ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کی جسمانی و عقلی ساخت پر حاوی ہے۔ مرد میں فعالیت ہے اور عورت میں انفعالیت ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ عورت پر مال خرچ کرتا ہے۔ اب یہ مال خرچ کرنے والی بات مغربی ممالک میں تو نہیں ہے کیونکہ وہاں مرد بھی کماتا ہے اور عورت بھی، لیکن بات یہ ہے کہ اسلام ایک جامع خاندانی نظام پیش کرتا ہے جس میں مرد کے ذمہ گھر کے باہر کی ذمہ داریاں ہیں اور عورت کے ذمہ گھر کے اندر کی ذمہ داریاں ہیں۔ اس سے ایک متوازن معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اب آپ مغرب کی طرف ہی دیکھ لیں۔ وہاں عورت گھر سے باہر نکل کر پیسے تو کما لیتی ہے، لیکن مجموعی طور پر معاشرہ خاندانی اقدار اور ان کی افادیت سے تہی دامن ہے۔ چنانچہ اسلام میں گھر کا حکمران مرد ہے۔ عورت حاکم تو نہیں ہے، لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر ایک منتظم ضرور ہے، جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے کہ: والمرأة راعية على بيت

بعلها وولده وهی مسئولة عنهم (بخاری، رقم ۲۵۵۴) لیکن بالاتری مرد کو حاصل ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظام، چھوٹا ہو یا بڑا، اس میں فائنل اتھارٹی ایک ہاتھ میں ہوگی تو نظام چلتا ہے، دو ہاتھوں میں یکساں ہو تو نظام نہیں چلتا۔ ایک ملک کے دو صدر ہوں یا ایک کمپنی میں یکساں اختیار رکھنے والے دو پریذیڈنٹس ہوں تو نظام نہیں چل سکتا۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ کائنات کا نظام ہزارہا برس سے صحیح کیوں چل رہا ہے؟ اس لیے کہ ان کا کنٹرول ایک ہاتھ میں ہے۔ قرآن کہتا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (الانبیاء ۲۱: ۲۲) یعنی اگر اختیارات کسی اور کے پاس بھی ہوتے تو بیڑا غرق ہو جاتا۔ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ (المومنون ۲۳: ۹۱) ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ الگ کھڑا ہوتا۔ ہر وقت جھگڑے ہی ہوتے رہتے۔ توحید کا فلسفہ یہی ہے کہ ایک ہی اللہ ہے جو ہر چیز کا حاکم اور مالک ہے۔ کسی بھی ادارے کا، کسی بھی کمپنی کا نظام اس وقت صحیح چلتا ہے جب اس کی فائنل اتھارٹی ایک ہاتھ میں ہوگی۔ گھر بھی ایک نظام ہے، اس کی فائنل اتھارٹی بھی ایک ہاتھ میں ہوگی تو نظام چلے گا۔ دو ہاتھوں میں ہوگی تو بیڑا غرق ہو جائے گا جیسے کہ مغرب کے خاندانی نظام کا ہو چکا ہے۔ آج مغرب سر پکڑے بیٹھا ہے کہ فیملی سسٹم کدھر گیا؟ میں آپ کو مغرب کے خاندانی نظام کا نقشہ بتاتا ہوں۔

مغرب کا خاندانی نظام

مغرب کی صورت حال یہ ہے کہ چچا، پھوپھی، خالہ کے رشتے تو گم ہو ہی گئے ہیں، والدین کے رشتے بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ باپ بھی اولڈ ہوم میں، ماں بھی اولڈ ہوم میں۔ میاں بیوی کی آپس کی لڑائیوں کے نتیجے میں وہاں شادی کے قوانین ایسے سخت ہیں کہ لوگ شادیاں کرنا گوارا ہی نہیں کرتے، بغیر شادی کے ہی اکٹھے رہے رہتے ہیں۔ کسی جوڑے کی سال دو سال ساتھ رہنے کے بعد انڈرسٹینڈنگ ہو گئی تو شادی ہو جائے گی، ورنہ کسی نئے ساتھی کی تلاش میں الگ ہو جائیں گے۔ کسی جوڑے کی شادی دو چار سال چل جائے تو اسے بڑی کامیاب شادی تسلیم کیا جاتا

ہے۔ بچے پیدا کرنا تو ان کی ترجیحات میں کوئی چوتھی پانچویں نمبر کی ترجیح ہوتا ہے۔ بچوں پر کیریئر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی جوڑے کو شوق آ ہی گیا بچے کا تو ماں کے پاس تو بچے کے لیے وقت نہیں ہے، اس نے تو اپنے کام پر جانا ہے۔ اس صورت میں ماں کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو بے بی سٹنگ کے لیے کسی ڈے کیئر سنٹر کے حوالے کر جاتی ہے۔ ایسے سنٹرز کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معقول معاوضے کے عوض ماؤں کی غیر موجودگی میں ان کے بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ کام کرنے والی بھی خواتین ہوتی ہیں جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اب ماں کسی اور کے لیے کام کر رہی ہے اور اس کے بچے کی دیکھ بھال کے لیے کوئی عورت اس کے لیے کام کر رہی ہے۔ میاں اپنے کام پر، بیوی اپنے کام پر، بچوں کے لیے تو وقت ہی نہیں ہوتا۔ جب دونوں کماتے الگ الگ ہیں تو پھر خرچ بھی اپنا اپنا کرتے ہیں۔ گھر کے خرچے میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ آخر میں تصویر یہی سامنے آتی ہے کہ دونوں نے اپنی جسمانی ضروریات کے لیے ایک سمجھوتہ کیا ہوا ہے اور بس۔ اور اکثریت تو اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ جسمانی ضرورت کے لیے کسی ایک ساتھی کو مستقل اپنے ساتھ چمٹائے رکھو۔ یہ میں مجموعی صورت حال بتا رہا ہوں۔ بہت سے خاندان ابھی بھی ہیں جو پرانی روایات پر چلتے ہوئے باقاعدہ رشتہ داریاں قائم کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بچے کی پہچان کے لیے باپ کا نام لکھتے ہیں۔ مغرب میں مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اکثر یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا باپ کون ہے۔ جب باپ کا پتہ نہیں ہوگا تو چچا، پھوپھی اور کزن وغیرہ کہاں سے آئیں گے۔ اس لیے مغرب میں بچے کی پہچان ماں کے نام سے کی جاتی ہے۔ اسے سنگل پیرنٹ کا قانون کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک این جی او نے مطالبہ کیا کہ یہ قانون ہمارے ہاں بھی نافذ کیا جائے۔ میں نے کہا بی بی، ہمارے ہاں ہزار میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو اپنے باپوں کا پتا ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی ایسی دقت پیش نہیں آتی جس کے لیے یہ قانون نافذ کیا جائے۔ روس کا سابق صدر گورباچوف مغرب کے بڑے دانشوروں میں سے ہے۔ روس کی جان اسی نے کمیونزم سے چھڑوائی ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے: پروسٹرائیکا۔ اس کتاب میں اس نے مغرب کے فیملی سسٹم پر بحث کی ہے۔ گورباچوف کہتا ہے کہ مغرب میں بھی

خاندانی نظام بہت مضبوط تھا، لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں یہ ہوا کہ لاکھوں کروڑوں افراد مارے گئے جس سے افرادی قوت کا خلا پیدا ہو گیا۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ کارخانوں میں مزدور نہیں، دفتر میں کلرک نہیں، تعلیمی اداروں میں اساتذہ اور عملہ نہیں۔ افرادی قوت ختم ہو گئی جس سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ گورباچوف کہتا ہے کہ ہم نے عورت کو ورغلایا کہ ہم تمہیں مردوں کے برابر کے حقوق دیتے ہیں۔ ہم نے عورت کو افرادی قوت کا خلا پر کرنے کے لیے گھر سے نکالا تاکہ دفتر خالی نہ رہیں، فیکٹریاں اور اسکول خالی نہ رہیں۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ ہمارے دفتر، اسکول، کارخانے تو بچ گئے، مگر گھر کا سارا نظام برباد ہو گیا۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ عورت واپس اپنے گھر جائے اور گھر کے انتظامات سنبھالے، لیکن اب عورت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ گورباچوف کہتا ہے کہ ہم تو راستے ڈھونڈ رہے ہیں کہ کسی طرح عورت کو اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ گھر میں رہے کہ گھر میں رہنا اس کے لیے بہتر ہے۔

اسلام کا خاندانی نظام اور مغربی دانش ور

برطانیہ کے ایک قومی سطح کے سیاسی لیڈر کا چند مہینے پہلے ایک طویل انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں اس نے کہا کہ میں اپنے ایک مسلمان دوست کے ہاں ۲۴ گھنٹے کے لیے جا کر رہا ہوں، یہ دیکھنے کے لیے ان کا فیملی سسٹم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے رشک آتا ہے کہ آپس میں ان کا اتنا جوڑ ہے۔ اس نے کہا کہ میرے وہاں رہنے کے دوران ان کے اتنے رشتہ دار ملنے کے لیے آئے کہ ہمارے ہاں کسی سال میں اتنے نہیں آتے۔ اور یہ رشک کا لفظ صرف برطانوی لیڈر نے نہیں، بلکہ امریکہ کی سابق خاتون اول ہیلری کلنٹن نے بھی بولا تھا۔ جن دنوں یہ خاتون اول تھی، اس نے اسلام آباد کا دورہ کیا۔ اس کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ مجھے مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک نوجوان لڑکی اپنے ماموں، چاچا، پھوپھی، خالہ کے حصار میں ہے۔ یہاں ''حصار'' کا لفظ اس نے حفاظت کے معنی میں استعمال کیا۔ ہیلری کلنٹن نے اپنے دورے کے دوران اسلام آباد کے ایک ویمن کالج کا دورہ کیا۔ اس نے وہاں کی ایک لڑکی سے پوچھا کہ اپنی تعلیم کے دوران عام طور پر تمہیں کیا مسئلہ

درپیش ہوتا ہے؟ لڑکی نے کہا کہ ہم یہاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، لیکن ہمیں اپنی ریسرچ کے لیے لائبریریز، لیبارٹریز اور متعلقہ وسائل کی کمی کا سامنا ہے جس کی وجہ سے ہماری تعلیم کمزور رہ جاتی ہے۔ پھر اس لڑکی نے امریکی صدر کی بیوی سے پوچھ لیا کہ آپ کے ہاں کالج کی لڑکی کو کیا مسئلہ درپیش ہوتا ہے؟ ہیلری نے کہا کہ ہمارے ہاں کالج تک پہنچتے پہنچتے لڑکی کی گود میں بچہ ہوتا ہے اور اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ تو ہیلری نے کہا، لیکن اگر بچہ نہ ہو تو بھی وہ اس وقت تک ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہوتی ہے جس میں بے احتیاطی کے نتیجے میں کئی لڑکیوں کو ابارشن کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

میں نے اس پر مضمون لکھا کہ بی بی، اسلام کا نظام دیکھو۔ قرآن کہتا ہے کہ: أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (النساء۴: ۲۴) کہ اگر کسی عورت کو ہاتھ لگانا ہے تو پہلے اس کی مالی ذمہ داری قبول کرو، مہر بھی اور نان نفقہ بھی اور پھر اس کا مقصد گھر بسانا ہو، صرف شہوت مقصد نہ ہو، اور گرل فرینڈ نہیں، بلکہ خاندان بنانا مقصود ہو۔ اسی طرح لڑکیوں کو بھی کہا: وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ (النساء۴: ۲۵) یعنی اسلام کہتا ہے کہ عورت کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرو، اس کے اور بچوں کی مالی ذمہ داری قبول کرو تو پھر جنسی خواہش کی طرف آؤ۔ نیز یہ رشتہ ریکارڈ پر ہو، خفیہ نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک مضمون میں ہیلری سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسلام کا سسٹم دیکھو، کتنا محفوظ اور نیچرل سسٹم ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تم جو کچھ عورت کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، اس کے تمام تر ممکنہ نتائج کی ذمہ داری قبول کرتے ہو تو اس کے قریب جاؤ، ورنہ کوڑے لگیں گے اور بعض صورتوں میں سنگسار بھی ہو سکتے ہو۔

عورت پر مغرب کا دوہرا ظلم

گورباچوف نے کہا کہ ہم نے عورت کو افرادی خلا پر کرنے کے لیے ورغلایا اور نعرہ یہ لگایا کہ ہم عورت کو مردوں کے مساوی حقوق دے رہے ہیں۔ اس پر میں نے برمنگھم میں ایک جگہ اپنی تقریر میں کہا کہ دیکھو، عورت کے ذمے گھر کے فرائض ہیں، خاوند کے ذمے باہر کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ قدرت کی تقسیم کار ہے کہ زندگی کے کچھ کاموں کی ذمہ داری عورت کے سپرد ہے اور کچھ مردوں

کے سپرد۔ مثلاً جو کام عورت کر سکتی ہے، وہ کام مرد تو نہیں کر سکتا۔ بچہ جننا، اسے دودھ پلانا، اس کی پرورش کرنا عورت کا کام ہے، مرد یہ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، انہوں نے عورت کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اسے کمانے میں تو اپنے ساتھ شریک کر لیا، لیکن اس کی کسی ڈیوٹی میں خود شریک نہیں ہوئے کہ چلو ایک بچہ تم جنو، ایک میں جنتا ہوں۔ یا ایک کو تم دودھ پلاؤ، دوسرے کو میں پلاتا ہوں، یا ایک بچے کو نہلانے دھلانے، اس کی جسمانی ضروریات کا تم خیال رکھو اور دوسرے کا میں رکھتا ہوں۔

اب عورت بچہ بھی جنے گی، اسے دودھ بھی پلائے گی، اس کی پرورش بھی کرے گی اور کمائے گی بھی۔ واضح طور پر مرد کو اپنی ذمہ داری میں شریک کیے بغیر عورت اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مرد کی ذمہ داریوں میں شریک ہوئی ہے۔ آیا یہ حقوق میں اشتراک ہے یا فرائض میں اشتراک ہے؟ عورت کے حقوق میں اضافہ ہوا ہے یا فرائض میں؟ ذرا کھلے ذہن سے اس پر غور کریں۔ اور اس سارے معاملے کو عنوان کیا ملا ہے؟ عورت کے مردوں کے ساتھ مساوی حقوق۔ اب آپ ہی بتائیے، عورت ناقص العقل ہے یا نہیں؟ اضافہ تو ہوا ڈیوٹی میں اور وہ خوش اس بات پر ہے کہ میرے حقوق برابر ہو گئے۔

یہ ڈے کیئر سنٹرز بچوں کے سنبھالنے کا کام کرتے ہیں جہاں مائیں اپنے بچوں کو صبح ڈال جاتی ہیں اور شام کو لے جاتی ہیں۔ اب اس سارے سسٹم سے کام تو چل جاتے ہیں، لیکن خاندان کا ایک نظام جو قدرت نے قائم کیا، اس کا ستیاناس ہو گیا جس کے سوسائٹی پر اجتماعی نقصانات کو مغرب کے دانشور نہ صرف شدت سے محسوس کر رہے ہیں بلکہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنی خاندانی اقدار کی طرف واپس جانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات عرض کرتا ہوں اور پھر ہم اس دفعہ کی تیسری شق پر بات کریں گے۔ ترکی ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ ترکی نے یورپ میں شامل ہونے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ خلافت اور دین چھوڑنے کے علاوہ بہت سی دنیوی قربانیاں بھی دی ہیں، صرف اس لیے کہ ترکی کو یورپین شمار کیا جائے۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کی، شرعی عدالتیں ختم کیں، مدارس ختم

کیے، مسلمانوں کی قیادت سے دست برداری اختیار کی، اس لیے کہ ہمیں یورپین یونین کا ممبر بنایا جائے۔ بہت منتیں کیں، ناک رگڑے، لیکن یورپی یونین اسے قبول نہیں کر رہی۔ یورپین یونین شرطیں لگاتی رہتی ہے، کبھی یہ شرط کبھی وہ شرط۔ ابھی چند سال پہلے یورپین یونین نے ایک نئی شرط لگائی کہ تمہارے ہاں قوانین میں جب کنبے کا ذکر ہوتا ہے تو کنبے کا سربراہ مرد کو لکھا جاتا ہے۔ یہ مرد اور عورت کی مساوات کے خلاف ہے، چنانچہ یہ انسانی حقوق کے منافی ہے۔ چنانچہ ترکی کی اسمبلی نے باقاعدہ قرارداد کر کے یہ قانون ختم کیا کہ مرد کنبے کا سربراہ ہے۔ اس کے باوجود یورپی یونین کی رکنیت اسے نہیں ملی۔

امریکی سپریم کورٹ میں کچھ عرصہ پہلے ایک رٹ دائر ہوئی تھی کہ بین الاقوامی قانون اور امریکی دستور یہ کہتا ہے کہ مرد اور عورت میں مساوات ہے، ان میں کوئی فرق نہیں، لیکن جب بھی خدا کا ذکر ہوتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ "خدا کہتا ہے"، یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ "خدا کہتی ہے"۔ اس پر سپریم کورٹ کے یہ ریمارکس اخبارات کی زینت بنے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ دونوں کہہ سکتے ہیں۔ کبھی یہ کہ "خدا کرتا ہے"، کبھی یہ کہ "خدا کرتی ہے۔"

دفعہ نمبر ۱۶ کی تیسری شق کے مطابق فسخ نکاح میں دونوں کا حق برابر ہے۔ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے، اسی طرح عورت کو بھی برابر کا طلاق دینے کا حق ہے، جبکہ اسلام میں مرد کو براہ راست طلاق کا جبکہ عورت کو مطالبہ طلاق کا حق حاصل ہے جسے خلع کہا جاتا ہے۔ اگر خاوند عورت کے مطالبہ پر طلاق نہ دے تو عورت کو تحکیم یا قضا کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے:
فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا۔ (النساء ۴: ۳۵) اب اگر عورت حق پر ہے، خاوند زیادتی پر ہے تو تحکیم یا قضا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر عورت کے لیے طلاق صادر کر دے۔ چنانچہ اسلام میں عملی طور پر مرد اور عورت دونوں کو طلاق کا حق حاصل ہے، لیکن ترجیحات کا فرق ہے۔ مرد کو بلاواسطہ، جبکہ عورت کو بالواسطہ طلاق کا حق حاصل ہے۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک کا فیصلہ میں برتر ہونا نظم کے لیے ضروری ہے۔ دونوں کے اس اتھارٹی میں برابر ہونے سے خاندان مستحکم نہیں رہے گا۔

عورت کو طلاق کا حق

یہ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو بھی مساوی طلاق کا حق دو۔ ہمارے حکمران دوطرفہ پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ ہماری طرف سے دباؤ ہوتا ہے تو ہمیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مغرب کی طرف سے دباؤ ہوتا ہے تو ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں عائلی قوانین نافذ ہوئے۔ اسی وقت نکاح کے فارم بھی بنے۔ نکاح کے فارم میں ایک تفویض طلاق کا خانہ بنایا گیا۔ فارم کا سوال کچھ اس طرح ہے: ''کیا خاوند نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟''

اسلامی طور پر خاوند اگر بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دے تو پھر بیوی کو بھی برابر کا طلاق کا حق مل جائے گا، لیکن ہوتا یہ ہے کہ نکاح کے وقت نکاح خواں میاں یا بیوی، کسی سے نہیں پوچھتا۔ ایک دفعہ میں نے ایک نکاح خواں کو نکاح کا فارم پر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ جب اس سوال پر پہنچا تو اس نے خود ہی اس پر کراس لگا دیا۔

ایک لطیفے کی بات ذہن میں آ گئی۔ ہمارے پاکستان کی سیاست کی ایک معروف خاتون ہیں۔ وہ ایک صاحب کے نکاح میں تھیں۔ میکے گئیں اور چند مہینوں کے بعد ایک اور نکاح کر لیا۔ خاوند نے اعتراض کر دیا کہ یہ تو میری بیوی ہے، اس نے نیا نکاح کیسے کر لیا؟ اس نے کہا کہ میں تو تمہاری بیوی نہیں رہی، اس لیے کہ تم نے مجھے نکاح کے فارم میں طلاق کا حق تفویض کیا تھا۔ میں نے وہی حق استعمال کیا ہے جو کہ شرعی بھی ہے اور قانونی بھی۔ میں نے خود ہی طلاق دی ہے، عدت گزاری ہے اور دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ مجھے تو اس تفویض طلاق کے حق کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔ بات عدالت میں چلی گئی۔ فیصلہ اس پر قرار پایا کہ اگر فارم میں تفویض طلاق کے سوال کے سامنے خانہ میں 'ہاں' ہے تو پھر طلاق ہے، اگر 'نہیں' تو پھر طلاق قرار نہیں پائی۔ عدالت نے فارم منگوائے۔ فارم پر اس سوال کے خانہ میں 'ہاں' لکھا تھا، جبکہ وہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے تو نکاح کے وقت کسی نے اس کے متعلق نہیں پوچھا۔ عملی طور پر ہوا یوں کہ وہ حق نکاح خواں نے خود ہی ان محترمہ کو تفویض کر دیا تھا۔

اس بات کو مرد اور عورت کی مساوات کے خلاف کہا جا رہا ہے کہ آپ لوگ عورت کو طلاق کا وہ حق نہیں دیتے جو خاوند کو ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور نے جن باتوں کو عقیدے میں شمار کیا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مرد اور عورت میں مساوات ہو۔ اس کے خلاف کوئی بھی بات ہو تو اسے جنس کی بنیاد پر امتیاز شمار کیا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہماری حکومت سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جنس کی بنیاد پر امتیاز کے تمام قوانین ختم کیے جائیں۔ بظاہر یہ نعرہ بہت خوشنما ہے کہ امتیازی قوانین ختم کر دیے جائیں۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امتیازی قوانین سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک کہتے ہیں جنس کی بنیاد پر امتیاز اور دوسرا مذہب کی بنیاد پر امتیاز۔ جنس کی بنیاد پر امتیاز کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاملہ میں مرد کے لیے قانون اور ہو اور عورت کے لیے کوئی اور ہو۔ لہٰذا یہ قانون کہ مرد کو براہ راست طلاق کا ہے جبکہ عورت کو نہیں، امتیازی قانون قرار پاتا ہے۔ اسلام میں مرد کو حکمرانی کا حق حاصل ہے جبکہ عورت کو نہیں۔ نماز کی امامت کے لیے مرد کو امام بننے کی اجازت ہے جبکہ عورت کو نہیں۔ ہمارے ہاں ایک مرد کی گواہی کے برابر دو عورتوں کی گواہی تسلیم کی جاتی ہے: فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ (البقرہ۲: ۲۸۲)۔ ہمارے ہاں مرد پابند نہیں ہے کہ وہ گھر سے باہر جائے تو پوچھ کر جائے۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ولی (خاوند، والد، بھائی وغیرہ) سے اجازت لے کر گھر سے جائے۔ مرد اس بات کا پابند نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وراثت میں مرد کا حصہ مختلف ہے اور عورت کا مختلف۔ یہ ساری باتیں جنس کی بنیاد پر امتیاز قرار پاتی ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ جنس کی بنیاد پر کوئی قانون روا نہیں رکھیں گے تو اس سے مراد قرآن وسنت کے وہ تمام احکام لیے جاتے ہیں جن میں کسی معاملے میں مرد کے لیے مختلف حکم ہو اور عورت کے لیے مختلف۔ اقوام متحدہ کا منشور کہتا ہے کہ ہم ایسے تمام قوانین ختم کر کے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات قائم کریں گے۔

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ ملک میں مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز کا قانون نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً ہمارے قانون میں ہے کہ ملک کا نہ تو صدر کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے اور نہ وزیر اعظم۔ اسے مذہب کی بنیاد پر امتیاز کہا جاتا ہے۔ مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سوسائٹی میں اپنے مذہب کی تبلیغ و پرچار

کرے۔ غیر مسلم کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مسلم سوسائٹی میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے۔ چنانچہ جب نعرہ لگتا ہے کہ مذہبی امتیاز کے قوانین ختم کر دیے جائیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جہاں جہاں بھی آپ مذہب کے حوالے سے قانون اور ضابطے میں فرق کرتے ہیں، ان سب قوانین کو ختم کر دیا جائے۔

ہمارے حکمرانوں نے عورت کو طلاق کا حق دینے کے حوالے سے ایک حیلہ اختیار کیا کہ نکاح کے فارم میں ایک شق رکھ دی کہ آیا مرد عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنا چاہتا ہے یا نہیں اور مغرب کو یہ فارم دکھا دیا گیا کہ ہم نے عورت کو طلاق کا حق دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں طلاق کا جو قانونی سسٹم رائج ہے، وہ یہ ہے کہ خاوند جب طلاق لکھ دیتا ہے تو اس کے لکھنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ طلاق نامہ عورت کو مل بھی جائے، پھر بھی واقع نہیں ہوتی۔ مروجہ قانون کے مطابق خاوند طلاق لکھ کر ثالثی کونسل کو بھیجے گا۔ ثالثی کونسل یہ ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔ ثالثی کونسل کو قانونی طور پر ہدایت ہے کہ جب بھی آپ کو کوئی طلاق کا نوٹس ملے تو آپ فریقین کو بلا کر صلح کروائیں، قطع نظر اس کے کہ طلاق کی نوعیت کیا ہے۔ طلاق رجعی ہے، بائن ہے، مغلظہ ہے یا فسخ نکاح ہے، ثالثی کونسل کو اس سے غرض نہیں ہے۔ قانون کے مطابق اگر ثالثی کونسل خاوند اور بیوی میں صلح کرانے میں کامیاب ہو جائے تو طلاق واقع نہیں ہوئی، چاہے طلاق رجعی ہو، بائن ہو، یا کچھ بھی ہو۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ثالثی کونسل صلح کرانے میں ناکام ہوگئی اور اس نے طلاق کی توثیق کردی تو اب قانوناً ثالثی کونسل کے دستخطوں کے بعد طلاق واقع ہوگئی۔ اب طلاق بھی یہیں سے شمار کی جائے گی اور عدت بھی، چاہے اصل طلاق کو چھ مہینے ہی کیوں نہ گزر گئے ہوں۔ یعنی ہمارے قانون کے مطابق طلاق کا وقوع ثالثی کونسل کے طلاق نامہ پر دستخط سے ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک لطیفے کی بات اور ذہن میں آگئی ہے۔ ایک دفعہ میں گوجرانوالہ کے ایک حلقہ کے ناظم صاحب سے ملنے گیا۔ ہمارے اچھے دوست ہیں۔ وہ اتفاق سے اس وقت ثالثی کونسل کے طور پر طلاق کا ایک مقدمہ سن رہے تھے۔ اس نے فریقین کو بلا رکھا تھا اور صلح کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا کارروائی دیکھنے کے لیے۔ اس نے کوئی آدھ پون گھنٹہ کوشش کی لیکن صلح کرانے

میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ خاتون صلح کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب ناظم صاحب خاتون سے کچھ اس طرح سے مخاطب ہوئے، ''صلح نہیں کرو گی تو پھر میں طلاق دے دوں؟'' میرے تو اس جملے پر کان کھڑے ہو گئے کہ یہ ناظم صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ طلاق آپ نے دینی ہے یا خاوند نے؟ وہ بھی مذاق سے کہنے لگے کہ مولانا صاحب، یہاں تو میں نے ہی دینی ہے۔ میں نے طلاق کے کاغذات اٹھا کر دیکھے تو شرعی لحاظ سے اس طلاق کو واقع ہوئے اڑھائی مہینے گزر چکے تھے۔ اب اتنے عرصے کے بعد ناظم صاحب عورت سے پوچھ رہے تھے کہ اگر تم نے صلح نہیں کرنی تو میں طلاق دے دوں!

بہر حال پہلا حیلہ اس سلسلے میں ہمارے حکمرانوں نے یہ اختیار کیا کہ تفویض طلاق کا خانہ نکاح نامے کے فارم میں شامل کر کے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے اس پر عمل کر دیا ہے۔ آخر مغرب کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ بات تو عملاً دھوکہ ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ نہیں بھئی، عورت کو قانوناً طلاق کا وہی حق دو جو مرد کو حاصل ہے۔ ہمارے حکمرانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اُدھر مغرب کو بھی 'ناں' نہیں کہہ سکتے اور اِدھر ہمیں بھی 'ناں' نہیں کہہ سکتے۔ یہ سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے اس حوالے سے دہرے تہرے طرز عمل ہیں۔ پہلا ترکی کا طرز عمل ہے کہ دین، شریعت سب کچھ چھوڑا کہ جو تم کہتے ہو، مانتے ہیں، ہمیں یورپین یونین میں شامل کرو، لیکن سب کچھ کر کے بھی انہیں صلہ نہیں ملا۔ دوسرا طالبان کا طرز عمل تھا کہ بھئی بالکل نہیں مانتے، جو کرنا ہے کر لو۔ اس کی انہوں نے سزا بھی بھگتی، لیکن مانے نہیں۔ بطور طرز عمل تو یہ دونوں قابل فہم ہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ تیسرا طرز عمل وہ ہے جو باقی تقریباً تمام مسلمان ممالک کا ہے۔ یہ لوگ درمیان میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جب مغرب کا دباؤ ہوتا ہے تو ان کے مطالبات کو نافذ کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، جب اپنے ملکوں کے عوام کا دباؤ ہوتا ہے تو ان کو خوش رکھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء۔ اب اس سلسلے میں ہمارے ہاں یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہائی کورٹس مسلسل یہ فیصلے کرتے جا رہے ہیں کہ خلع جو ہے، یہ عورت کا مطلق حق طلاق ہے اور یہ کہ اس میں صرف اصطلاح کا فرق ہے، ورنہ بات ایک ہی ہے۔ خاوند کے حق کو

طلاق کہتے ہیں اور عورت کے حق کو خلع۔ لاہور ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ خلع عورت کا مطلقاً حق طلاق ہے۔ اسی طرح کا ایک فیصلہ سندھ ہائیکورٹ کا بھی آ چکا ہے۔

آج سے چند سال قبل ایک ویمن کمیشن بنا جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے جسٹس زاہد اسلم صاحب تھے جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس کمیشن نے سفارشات پیش کیں کہ خلع کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ اس کمیشن نے جو طریقہ کار تجویز کیا، وہ یہ تھا کہ جس طرح مرد طلاق نامہ لکھ کر ثالثی کونسل کو بھیجتا ہے، جس کا نام اب تبدیل کر کے فیملی کورٹ رکھا جا رہا ہے، اسی طرح عورت بھی طلاق کا نوٹس فیملی کورٹ کو بھیجے گی۔ ایک نقل خاوند کو اور ایک نقل فیملی کورٹ کو۔ اب اگر فیملی کورٹ نے اس نوٹس کو سماعت کے لیے منظور کر لیا تو اس کے ساتھ ہی وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہیں گے۔ ان کی ازدواجی حیثیت معطل ہو جائے گی۔

آزادیٔ رائے اور آزادیٔ مذہب

دفعہ نمبر ۱۸:

○ "ہر انسان کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے، پبلک یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔"

○ "ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے، جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔"

تبصرہ:

یہ آزادیٔ مذہب اور آزادیٔ رائے کا حق کہلاتا ہے۔ اس پر بھی ہم سے ان لوگوں کا بہت لمبا تنازعہ ہے۔ مثلاً، کیا ہم اپنے ملک میں قرآن کریم کے کسی حکم کے خلاف کسی شخص کو رائے رکھنے کا حق دیتے ہیں؟ یا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے کوئی منفی رائے دینے کا حق دیتے ہیں؟

خدا اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہنے کا حق دیتے ہیں؟ ان لوگوں کے مطابق ہم آزادیٔ رائے کے حق کو مجروح کر رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بھئی، اگر کسی شخص کی خدا کے خلاف ایک رائے قائم ہوگئی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں اسے روکنے والے؟ قرآن و رسول کی کسی بات پر ایک شخص مطمئن نہیں، اس نے اس کے خلاف ایک رائے قائم کرلی ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ یعنی آزادیٔ رائے کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص کوئی بھی رائے، کوئی بھی فکر، کسی بھی قسم کے خیالات قائم کرے اور پھر ان کی تبلیغ کرنا چاہے تو یہ اس شخص کا حق ہے۔

گستاخانِ رسولؐ اور مغرب

آج کل آزادیٔ رائے کا حق استعمال کیسے ہو رہا ہے؟ ایک معروف شخص ہے سلمان رُشدی جو پہلے انڈین تھا، اب برطانوی ہے۔ Satanic Verses (شیطانی آیات) ناول کے انداز کی ایک کتاب ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ازواج مطہراتؓ اور اکابر صحابہ کرامؓ کو اس نے بہت توہین آمیز انداز سے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس نے تمسخر کے انداز سے اس دور کی اکابر شخصیات کا اپنے ناول میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب پر دنیا بھر میں اعتراض ہوا کہ یہ ہم مسلمانوں کے اکابر کی توہین ہے۔ مسلمانوں نے سلمان رُشدی کو گستاخِ رسول قرار دیتے ہوئے اسے قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دیں، لیکن حکومت برطانیہ نے اُس شخص کو اپنی پناہ میں لے لیا اور کئی سالوں سے حکومت برطانیہ اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس حفاظت پر لاکھوں پاؤنڈ سالانہ خرچ ہوتا ہے اور حکومت برطانیہ کہتی ہے کہ ہم صرف ایک شخص کی حفاظت نہیں کر رہے، بلکہ ہم آزادیٔ رائے کے حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا ہے کہ اگر ایک شخص کا تمہارے مذہبی رہنما محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ذہن ہوگیا ہے تو تم لوگ اسے بات کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ اگر آپ کو اس کی بات سے اختلاف ہے تو آپ تسلیم نہ کریں، لیکن آپ اسے اس کی رائے کے اظہار سے کیوں روکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک اور مثال تسلیمہ نسرین کی ہے۔ اس نے بھی اس طرح کی خرافات پر مشتمل چند کتابیں لکھیں۔ بنگلہ دیش کے علما نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اسے گرفتار کروا دیا۔

یورپی یونین نے باقاعدہ سرکاری سطح پر اس کو رہا کرانے کا بندوبست کیا اور ان کا نمائندہ باقاعدہ ڈھاکہ آیا اور اسے چھڑوا کر ساتھ لے کر گیا۔ وہاں اسے مال بھی دیا گیا اور پناہ بھی دی گئی۔

مصر کے ایک صاحب ہیں ڈاکٹر نصر ابوزید۔ قاہرہ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی: الوحی فی مواجهة العقل، ''وحی اور عقل کا تقابل''۔ وہی معتزلہ والی بات کہ وحی بنیاد ہے یا عقل۔ عقل کو وحی پر پرکھیں گے یا وحی کو عقل پر؟ پرانا جھگڑا نئے انداز میں اٹھایا ہے۔ ہمارے ہاں عقل کی نفی نہیں کی جاتی، لیکن عقل کے لیے معیار وحی کو قرار دیا جاتا ہے، جبکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم وحی کو عقل پر پرکھیں گے۔ ڈاکٹر نصر ابوزید نے عقل کی برتری پر بڑے دلائل دیے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، میں اس کے چند ایک جملے نقل کرتا ہوں۔ نصر ابوزید کہتا ہے کہ دیکھیں، آج کا ایک شخص جو ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے، انٹرنیٹ استعمال کرتا ہے، آج کی جدید ٹیکنالوجی پر عبور رکھتا ہے، اِس شخص کو اُس شخص کی پیروی کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جو خیموں میں رہتا تھا اور خچر پر سواری کرتا تھا۔ یہ ڈاکٹر نصر ابوزید کے بات کرنے کا انداز نقل کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک ان اساطیر اور خرافات سے آج کی نسل نجات حاصل نہیں کرے گی، ترقی نہیں کر پائے گی جن اساطیر اور خرافات سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ (نعوذ باللہ)

جس طرح ہمارے ہاں توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون ہے، اس طرح کا کوئی قانون مصر میں نہیں ہے۔ ہمارے اس قانون پر دنیا کو اعتراض ہے کہ ایک آدمی کی رائے اگر قرآن اور رسول اللہؐ کے خلاف ہو گئی ہے تو اس پر اسے تم موت کی سزا کیسے دے سکتے ہو؟ چنانچہ اس قانون کو ختم کرنے کے لیے مسلسل مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہم پر اس قانون کو ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ یہ آزادئ رائے کے منافی ہے۔ مصر میں توہین رسالت پر سزا کا قانون تو نہیں ہے، لیکن وہاں شافعی فقہ کے مطابق عائلی قوانین نافذ ہیں۔ چنانچہ مصر کے وکلا نے عدالت میں فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا کہ یہ شخص ایسی باتیں کہہ کر چونکہ مسلمان نہیں رہا، اس لیے اس کا نکاح اس کی بیوی سے ٹوٹ گیا ہے۔ عدالت نے تفریق کی ڈگری جاری کر دی۔ اس شخص کو بھی ڈنمارک کی حکومت نے پناہ دے دی جہاں وہ عیاشی کی زندگی بسر کرتا رہا۔

اسی طرح ڈنمارک کے اخبارات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر توہین آمیز کارٹون چھاپے جن پر ابھی تک جھگڑا چل رہا ہے۔ ان اخبارات کا موقف بھی اسی دفعہ کے حوالے سے ہے کہ آزادیٔ خیال، آزادیٔ فکر، آزادیٔ رائے اور اپنی رائے کی اشاعت، یہ سب ہمارے حقوق ہیں۔ ہم نے اگر یہ کارٹون چھاپے ہیں تو اپنا حق استعمال کیا ہے۔

ہمارے ہاں آزادیٔ رائے کا حق مطلقاً نہیں دیا جاتا۔ وہ تمام قوانین جن میں توہین رسالت کا قانون بھی ہے، کسی غیر مسلم کو اپنے مذہب کی عام تبلیغ نہ کرنے کی پابندی بھی ہے اور خدا اور رسول اور شعائر اسلام وغیرہ کے خلاف بات نہ کرنے کی پابندی بھی ہے، یہ سب انسانی حقوق کے منافی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال امریکہ نے ہماری حکومت سے آن ریکارڈ تین مطالبات کیے تھے۔ پہلا یہ کہ حدود آرڈیننس کو ختم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ توہین رسالت کی سزا کا قانون ختم کیا جائے۔ تیسرا یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا قانون ختم کیا جائے۔ پہلا مطالبہ تو ہماری حکومت نے حدود آرڈیننس کا صفایا کر کے پورا کر دیا ہے۔ باقی دو مطالبوں کے متعلق امریکہ کو یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ الیکشن کے بعد پورے کر دیے جائیں گے۔

ارتداد اور قادیانی مسئلہ

یہ جھگڑے تو آزادیٔ رائے کے حوالے سے ہیں۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ آزادیٔ مذہب کے حوالے سے ہمارے کیا تنازعات ہیں۔

آزادیٔ مذہب کے حوالے سے یہ لوگ دو باتیں کہتے ہیں۔ ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مذہب کو تبدیل کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس شخص کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ ہم اسلام سے منحرف ہونے والے کو مرتد کہتے ہیں اور اسے سزا کا مستحق سمجھتے ہیں۔

دوسری بات یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی ملک میں مذہب کی بنیاد پر امتیازی قوانین نہیں بنائے جائیں گے۔ یہ بات ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا قانون بنایا گیا۔ قادیانیوں کے بارے میں علما نے بہت بحث کی ہے۔ جو شخص

مسلمان سے قادیانی ہوا ہے، اسے شرعی اصطلاح میں ہم مرتد کہتے ہیں اور جو شخص کسی قادیانی کے ہاں پیدا ہوا ہے، اسے زندیق کہا جاتا ہے۔ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا دعویٰ اور پرچار کیا، اسے یہ شوق ہوا کہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز پر اردگرد کے حکمرانوں کو اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دے۔ اس نے ایک خط والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کو بھیجا کہ تم میرا مذہب قبول کرلو۔ پٹھانوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ ایک آزاد اور خود مختار حکمران تھا۔ اس نے جواب بھیجا اور ایک جملہ لکھا کہ: ''ایں جابیا'' کہ یہاں آ کر بات کرو۔

مرزا نے کابل میں دو نمائندے بھیجے، امیر نے دونوں کو لٹکا دیا۔ اس پر بحث چھڑ گئی کہ آیا مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کیا گیا کہ آیا قرآن میں ارتداد کی سزا ہے یا نہیں۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ایک رسالہ ہے ''الشہاب''۔ اس رسالہ میں حضرت شیخ نے قرآن کریم سے استدلال کیا ہے۔ ہمارے ہاں ایک اصول ہے کہ اگر قرآن کریم گزشتہ مذاہب کا کوئی حکم بیان کرے اور اس کی تنسیخ نہ کرے تو وہ حکم ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ پچھلے مذاہب کے لیے تھا۔ مثلاً قرآن نے قصاص کے بارے میں تورات کا قانون حکماً نہیں بلکہ حکایتاً بیان کیا ہے اور یہ ہمارے لیے بھی حکم ہے۔ علامہ عثمانی نے کہا کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم پرانی شریعتوں کا کوئی حکم بیان کرے اور پھر اس کی تنسیخ کی بات نہ کرے تو وہ جیسے پچھلی امتوں کے لیے قانون تھا، ویسے ہی ہمارے لیے بھی قانون ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ بنی اسرائیل میں بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ (البقرہ۲: ۵۴) کہہ کر ارتداد کی سزا دی اور پھر کسی جگہ پر اس کو منسوخ نہیں کیا۔

جب پاکستان بنا تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ قادیانیوں کا کیا معاملہ ہوگا۔ ہمارے علما نے پاکستان بننے کے بعد تین چار بڑے مسائل پر غیر معمولی اجتہادات کیے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ قادیانیوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ اس پر تمام مکاتب فکر کے علماء، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، سب نے متفق ہو کر ایک اجتہادی فیصلہ یہ کیا کہ قادیانیوں پر ہم قتل کا حکم جاری نہیں کریں گے، بلکہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے گا۔ یہ تجویز اصل میں علامہ اقبال مرحوم کی تھی کہ اتنے

گھمبیر حالات میں قادیانیوں کو اتنے بڑے پیمانے پر قتل نہیں کیا جاسکے گا، اس کا بہتر حل یہ ہے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دلوا دیا جائے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۳ء میں ایک تحریک چلی۔ پھر ۱۹۷۴ء میں ایک اور تحریک چلی جس میں حضرت مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالحق اور دیگر بڑے اکابر علماء رحمہم اللہ اجمعین شریک تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ قادیانیوں نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ ہم ہی مسلمان ہیں۔

۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاء الحق نے یہ آرڈیننس جاری کیا کہ قادیانیوں کو اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ اسلام کے شعائر استعمال نہیں کر سکیں گے، مثلاً ام المؤمنین، مسجد، نماز، روزہ وغیرہ کی اصطلاحات استعمال نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ یہ دو قوانین بھی بین الاقوامی حلقوں کی نظر میں متنازعہ ہیں۔ جب ہم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ قادیانیوں کے خلاف اقدامات منسوخ کیے جائیں تو ان سے مراد یہی دو قوانین ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ایک بہت بڑا مغالطہ ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس سلسلہ میں ہمیں بہت مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

قادیانی غیر مسلم کیوں ہیں؟

۱۹۸۷ء میں نیویارک میں میرا ایک یہودی صحافی سے مکالمہ ہوا۔ میرے ایک دوست نے اس کا اہتمام کیا۔ ان دنوں یہ مسئلہ بڑے زوروں پر تھا۔ اس نے سوال کیا کہ جب قادیانی قرآن کو بھی مانتے ہیں اور محمد کو بھی مانتے ہیں تو وہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ اب اللہ کو تو اور بہت سے لوگ مانتے ہیں، اس لیے بظاہر تو مسلمان ہونے کی امتیازی علامت یہی ہے کہ وہ قرآن کو مانتا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مانتا ہو۔ میں نے اس کے سامنے لمبے چوڑے دلائل دینے کے بجائے الٹا اس سے ایک سوال کر دیا۔ میں نے کہا کہ تم یہودی ہو، تم حضرت موسیٰ اور تورات کو مانتے ہو؟ کہنے لگا، ہاں۔ میں نے کہا کہ عیسائی بھی موسیٰ اور تورات کو مانتے ہیں۔ اگر کوئی عیسائی یہودی ہونے کا دعویٰ کر دے تو کیا تم مان لو گے؟ کہنے لگا، نہیں۔ میں ایک عیسائی کو یہودی کیسے مان سکتا ہوں؟ میں نے پوچھا، کیوں؟ اس نے کہا کہ وہ موسیٰ اور تورات کے بعد عیسیٰ اور انجیل کو بھی مانتے ہیں، اس

لیے وہ یہودی نہیں ہو سکتے۔ وہ الگ ہیں۔ میں نے کہا کہ دیکھو، میں عیسیٰ، موسیٰ، تورات، انجیل اِن سب کو مانتا ہوں۔ میں اگر یہ کہہ دوں کہ میں یہودی ہوں تو مان لو گے؟ کہنے لگا، نہیں، اس لیے کہ تم ان سب کے بعد قرآن اور محمدؐ کو بھی مانتے ہو۔ میں نے کہا، پھر تو یہ اصول یہ ہوا کہ نئی کتاب اور نئے رسول کو ماننے سے مذہب الگ ہو جاتا ہے، اس لیے میں یہ چیلنج نہیں کرتا کہ قادیانی قرآن اور محمدؐ کو نہیں مانتے۔ وہ موسیٰ اور تورات، عیسیٰ اور انجیل، قرآن اور محمدؐ سب کو مانتے ہوں گے، لیکن ان کے بعد ایک اور نبی کو بھی مانتے ہیں، اس لیے میں انہیں یہودی، عیسائی اور مسلمان، ان تینوں میں سے کچھ بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ قادیانی مرزا غلام احمد کو نبی اور ''تذکرہ'' نامی کتاب کو وحی کی کتاب مانتے ہیں۔ اس صحافی نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ چونکہ وہ ایک نئے نبی اور ایک نئی کتاب کو مانتے ہیں، اس لیے وہ مسلمان کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔

اس نے ایک اور سوال کر دیا کہ تم لوگ انہیں مسجد بنانے، اذان دینے اور کلمہ وغیرہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہو؟ یہ تو انسانی حقوق کے منافی ہے۔ میں نے کہا، میرے بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔ ایک کمپنی ہے جو سو سال سے چلی آ رہی ہے۔ اس کا ایک نام ہے، ایک ٹریڈ مارک ہے۔ اس کمپنی کی مارکیٹ میں ایک ساکھ ہے اور لوگ اس کے ٹریڈ مارک کو دیکھ کر اس کی اشیا خریدتے ہیں۔ اب اگر اس میں سے دو چار آدمی الگ ہو کر نئی کمپنی بنا لیں، کیا اس نئی کمپنی کو پرانی کمپنی کا نام یا اس کا ٹریڈ مارک استعمال کرنے کا حق حاصل ہے؟ وہ جرنلسٹ کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا، اگر وہ ایسا کریں تو؟ کہنے لگا کہ یہ تو فراڈ ہے۔ میں نے کہا، ہم لوگ یہی تو کہہ رہے ہیں کہ قادیانی ہمارے ساتھ فراڈ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، بھئی ہم چودہ سو سال سے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری کمپنی کا نام اسلام ہے۔ کلمہ، امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین، مسجد، اذان، نماز، یہ سب ہمارے ٹریڈ مارکس ہیں۔ اب کچھ لوگوں نے نئی کمپنی بنا کر اس کا یہی نام اور یہی ٹریڈ مارکس رکھ لیے ہیں۔ ہمارا مطالبہ تو بس یہ ہے کہ بھئی، اپنا نام اور ٹریڈ مارک الگ کرو۔ یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی بات ہو گئی ہے۔ زیادتی پر زیادتی وہ لوگ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ہم جب عدالت میں جا کر انصاف طلب کرتے ہیں تو یہ الزام ہم پر لگ جاتا ہے کہ ہم اُن لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ شناخت تو ہماری

مجروح ہو رہی ہے، ہمارے نام اور ہمارے ٹریڈ مارکس پر یہ لوگ دو نمبر مال بیچ رہے ہیں۔

امریکہ، مغرب اور اقوام متحدہ وغیرہ ہم سے کہتے ہیں کہ جب آزادئ رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے تو آپ قادیانیوں پر پابندیاں کیوں لگاتے ہیں؟ یہ انسانی حقوق کے منافی ہے، آزادئ مذہب کے خلاف ہے، آزادئ فکر کے خلاف ہے اور اس سارے الزام کی بنیاد اقوام متحدہ کے منشور کی یہ دفعہ ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر آپ لوگوں نے اس منشور پر دستخط کر رکھے ہیں تو آپ اِس منشور کی اِس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اس کے خلاف آپ لوگوں نے قوانین کیوں بنا رکھے ہیں۔

ہماری اصل الجھن یہ ہے کہ ہم نے اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط بھی کر رکھے ہیں، اس لیے کہ ہم نے بین الاقوامی برادری کے ساتھ مل کر رہنا ہے، اس کے بغیر رہنا عملاً کم از کم ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور دوسری طرف ہم مذہب کی طرف سے پابند ہیں کہ اپنی نصوص صریحہ اور قطعیہ کے خلاف عمل بھی نہیں کر سکتے۔

اقوام متحدہ نے تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق اصول طے کیے ہوئے ہیں۔ جس طرح خاندانی زندگی کا ایک معیار طے کر رکھا ہے کہ اس سے ہٹ کر جو بھی بات اور قانون ہوگا، اسے یہ انسانی حقوق کے منافی قرار دیں گے اور جس طرح سزاؤں اور تعزیرات کے انہوں نے اصول قائم کیے ہوئے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی قانون ہوگا تو اسے انسانی حقوق کے خلاف سمجھا جائے گا، اسی طرح آزادئ رائے، آزادئ مذہب کا ایک معیار انہوں نے قائم کیا ہوا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی بات ہوگی تو اسے یہ لوگ انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خاندانی نظام، عدالتی نظام، مالیاتی نظام، سیاسی نظام اور دیگر زندگی کے شعبوں کے متعلق انہوں نے مخصوص معیار قائم کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اقوام متحدہ نے یہ بھی طے کر رکھا ہے کہ وہ کس سیاسی نظام کو صحیح سمجھیں گے اور کس نظام کو صحیح نہیں سمجھیں گے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کا منشور سیاسی نظام کے متعلق کیا کہتا ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

دفعہ نمبر ۲۱:

''ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔ ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔ عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔''

تبصرہ:

یعنی اقوام متحدہ کے نزدیک ایک جائز حکومت وہ کہلائے گی جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو اور ملک کے ہر شہری کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس میں رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ جو حکومت اس معیار پر پورا نہیں اترتی، وہ اقوام متحدہ کے نزدیک جائز حکومت قرار نہیں پائے گی۔

اس میں تین چار الگ الگ مسئلے ہیں۔ آج ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جمہوریت اور اسلامی نظام میں کیا فرق ہے اور جمہوریت کس حد تک جائز ہے؟ پہلے تو میں اپنے نظام کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ اسلام کے سیاسی نظام کی اصطلاح ہے ''خلافت''۔ قرآن کریم نے یہ اصطلاح دی ہے:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص ۳۸:۲۶)

''اے داود، ہم نے تمھیں زمین میں صاحب اقتدار بنایا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا:

كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء، كلما هلك نبي خلفه نبي، وانه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء فيكثرون (بخاری، رقم ۳۴۵۵)

''بنی اسرائیل میں انبیا سیاسی نظام کی قیادت کرتے تھے۔ جب کوئی نبی فوت ہو جاتا تو اس کی

جگہ دوسرا نبی آجاتا تھا۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، ہاں خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے۔"

بخاری شریف کی یہ حدیث اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد ہے۔

خلافت اور امامت کا فرق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیاسی نظام کے حوالے سے جو سب سے پہلا اور سب سے بڑا جھگڑا قرار دیا جاتا ہے، وہ خلافت اور امامت کے حوالہ سے ہے۔ ہمارے ہاں حضورؐ کے بعد سیاسی نظام خلافت کے نام سے ہے۔ اہل تشیع کے ہاں یہ نظام امامت کے نام سے ہے۔

خلافت اور امامت میں تین بنیادی فرق ہیں:

پہلا فرق یہ ہے کہ خلافت منصوص نہیں، بلکہ امت کے اختیار پر ہے، جبکہ امامت منصوص ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ خلافت خاندانی یا نسبی نہیں ہے، جبکہ امامت خاندانی ہے۔ اہل تشیع کے بارہ امام ایک ہی خاندان سے ہیں، جبکہ یہ خمینی صاحب اور خامنہ ای صاحب وغیرہم تو امام غائب کے نمائندے ہیں۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے۔ خلیفہ کی کسی بھی بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، جبکہ امام معصوم ہے اور امام کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ امام جو کہہ دے، وہی قرآن کی منشا ہے اور جو کہہ دے، وہی سنت کا مقصد ہے۔ امام کے معصوم ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ غلطی سے پاک ہے۔ دوسرے لفظوں میں امام اتھارٹی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ امت مسلمہ کی اکثریت یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک خلافت کی بنیاد ان اصولوں پر ہے کہ:

(۱) خلیفہ کا انتخاب عام مسلمانوں کی مرضی سے ہوگا،

(۲) خلافت نسبی یا خاندانی نہیں ہوگی،

(۳) خلیفہ شخصی اتھارٹی کی بجائے قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرے گا،

(۴) خلیفہ کی کسی بھی بات اور کسی بھی فیصلے سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

اسے سیاسی اصطلاح میں قانون اور دلیل کی حکومت کہتے ہیں، کیونکہ بادشاہت میں بادشاہ ہی

خود اختیاری ہوتا تھا مگر خلیفہ ایک پہلے سے طے شدہ قانون کا پابند ہوتا ہے اور اسے اسی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر جمہوریت کا معنی یہ ہے کہ حکومت عوام کی منتخب کردہ ہو اور ان کی مرضی سے قائم ہو تو یہ جمہوریت سب سے پہلے اسلام نے قائم کی ہے۔ البتہ ہماری اصطلاح جمہوریت نہیں بلکہ شورائیت ہے۔ مگر جمہوریت کے دوسرے رُخ کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے کہ عوام اور ان کے منتخب نمائندے تمام فیصلوں میں آزاد ہیں اور وہ جو بھی طے کر دیں، وہی قانون ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے جو اختیار بادشاہ کو حاصل ہوتی تھی، جمہوریت میں وہی اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو گئی ہے، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ حکمران، پارلیمنٹ اور عوام تینوں کو قرآن وسنت کا پابند دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اسلامی خلافت کا بنیادی اصول ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے ''پارلیمنٹ کی خود مختاری'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہم جب یہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ قرآن وسنت کی پابند ہو گی تو اس پر جدید سیاسی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ''پارلیمنٹ کی خود مختاری'' کے خلاف ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات اور قراردادِ مقاصد کی صورت میں تین اجتہادی اصول طے کیے:

- حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔
- حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے۔
- حکومت اور پارلیمنٹ قرآن وسنت کے پابند ہوں گے۔

بہر حال سیاسی نظام کے حوالہ سے اقوام متحدہ کے طے کردہ اصولوں کے بارے میں ہمارے یہ تحفظات ہیں جن کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے اور ہمارے ان عقائد پر ہے جن سے ہم کسی صورت میں دست بردار نہیں ہو سکتے، لیکن عالمی اداروں کا اقوام متحدہ کے منشور کے عنوان سے ہم پر مسلسل دباؤ ہے کہ ہم حکومت، دستور و قانون اور پارلیمنٹ کو مذہب کے اثر سے آزاد کر کے عوام اور پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری کے تصور کو تسلیم کریں جس کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔

خلاصہ بحث

محترم علماء کرام! میں نے تین چار نشستوں میں آپ حضرات کے سامنے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی چند دفعات پر تبصرہ کیا ہے اور ان تحفظات سے آگاہ کیا ہے جو اسلامی عقائد اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی بنیاد پر ہم اس بین الاقوامی قانون کے بارے میں رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی علمی مرکز میں ایک مستقل کام کے طور پر اس موضوع کو اختیار کرتے ہوئے جید علماء کرام کی ایک ٹیم اقوام متحدہ کے اس منشور کا شق وار جائزہ لے اور تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرے کہ:

- انسانی حقوق کے اس منشور کی کون کون سی بات ہمارے لیے قابل قبول ہے،
- ہمیں کس کس بات سے اختلاف ہے اور کون سی باتیں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں،
- اختلاف کی وجوہ اور ہماری ترجیحات کے دلائل کیا ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کی برتری اور افادیت کو بھی آج کے اسلوب میں بیان کیا جائے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ یہ منشور نہ سارے کا سارا قابل قبول ہے اور نہ ہی پورے منشور کو یکسر مسترد کر دینا درست ہے۔ اسی طرح میری طالب علمانہ رائے یہ بھی ہے کہ جن امور میں ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ اصول اجتہاد کے دائرے میں رہتے ہوئے آج کے عالمی عرف اور بین الاقوامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ایڈجسٹمنٹ کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور مسائل و امور کے پوری طرح تجزیہ و تنقیح کے بعد جو موقف واضح ہو کر سامنے آئے، اسے مغرب کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ پیش کر کے اس کے لیے عالمی سطح پر لابنگ اور ذہن سازی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اسلام کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں اور آج کے ماحول، عالمی عرف اور بین الاقوامی اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کے لیے اسباب و مواقع، ثمرات و نتائج اور قبولیت و رضا سے بہرہ ور فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

ضمیمہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے منظور کردہ

انسانی حقوق کے عالمی منشور کا متن

تمام بنی نوع انسان مساوی اور ناقابل تغیر حقوق اور بنیادی آزادیاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔
اقوام متحدہ ہر فرد کے انسانی حقوق کے تحفظ و ترقی کا پرچم بلند رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ذمہ داری اور وابستگی اقوام متحدہ کے منشور سے ماخوذ ہے جس میں انسان کی حرمت و وقار اور بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں دنیا کے عوام کے یقین کی توثیق کی گئی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا۔

تمہید و متن

چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔

چونکہ انسانی حقوق سے لاپروائی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رہیں۔

چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔

اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آ کر جبر و استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے۔

چونکہ رکن اقوام نے اقوام متحدہ کے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت و وقار اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

چونکہ رکن ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کرائیں گے۔

چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں۔ لہٰذا اب

جنرل اسمبلی

اعلان کرتی ہے کہ:

انسانی حقوق کا عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہوگا تا کہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے رکن ممالکوں میں اور ان قوموں میں جو رکن ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کے لیے بتدریج کوشش کر سکے۔

دفعہ ۱:

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ ۲:

(۱) ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس

کے حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔

(۲) اس کے علاوہ جس علاقے سے جو شخص تعلق رکھتا ہے، اس کی سیاسی کیفیت کا دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنا پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

دفعہ ۳:

ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ ۴:

کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ ۵:

کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز یا گھٹیا سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ ۶:

ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے۔

دفعہ ۷:

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حقدار ہیں۔ اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کے لیے ترغیب دی جائے، اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حقدار ہیں۔

دفعہ ۸:

ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کو تلف

کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے پر چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ ۹:

کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی پر گرفتار، نظر بند یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۰:

ہر ایک شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانبدار عدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ ۱۱:

(۱) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری کا الزام عائد کیا جائے، بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے تاوقتیکہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا چکا ہو۔

(۲) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بنا پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۲:

کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھربار، خط کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی ایسی کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔

دفعہ ۱۳:

(۱) ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

(۲) ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے، چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی

طرح اسے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ ۱۴:

(۱) ہر شخص کو ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے اور پناہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(۲) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہے جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

دفعہ ۱۵:

(۱) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(۲) کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۶:

(۱) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے، شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(۲) شادی فریقین کی مکمل اور آزادانہ رضامندی سے ہوگی۔

(۳) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے تحفظ کا حق دار ہے۔

دفعہ ۱۷:

(۱) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(۲) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۸:

ہر انسان کو آزادئ فکر، آزادئ ضمیر اور آزادئ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسوم پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ ۱۹:

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے، بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ ۲۰:

(۱) ہر شخص کو پرامن طریقے پر ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(۲) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ ۲۱:

(۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(۲) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(۳) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہو گی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریق رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ ۲۲:

معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی کہ وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی،

معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو حاصل کرے جو اس کی عزت اور شخصیت کے نشو ونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ ۲۳:

(۱) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(۲) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(۳) ہر شخص جو کام کرتا ہے، وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(۴) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۲۴:

ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ ۲۵:

(۱) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا، ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

(۲) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی سے پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ ۲۶:

(۱) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم مفت ہوگی کم از کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(۲) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو ونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(۳) والدین کو اس بات کے انتخاب کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ ۲۷:

(۱) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(۲) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفاد کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، عملی یا ادبی تصنیف سے جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ ۲۸:

ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں پیش کردیے گئے ہیں۔

دفعہ ۲۹:

(۱) ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشو ونما ممکن ہے۔

(۲) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو

دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

(۳) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ ۳۰:

اِس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی چند علمی وفکری مطبوعات

☆ علوم الحدیث - اصول ومبادی

تحقیقات: شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ - ترتیب وتدوین: محمد عمار خان ناصر

☆ خطبہ حجۃ الوداع: اسلامی تعلیمات کا عالمی منشور

تدوین متن: محمد عمار خان ناصر۔ توضیحی محاضرات: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ جہاد، مزاحمت اور بغاوت (اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ)

از: پروفیسر مشتاق احمد

☆ متون حدیث پر اعتراضات واشکالات - ایک تحقیقی جائزہ از: ڈاکٹر محمد اکرم ورک

☆ مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم خطبات ومحاضرات از: ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

☆ خطبات راشدی (جلد اول) از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے ساتھ ایک علمی وفکری مکالمہ

از: ابوعمار زاہد الراشدی/معز امجد/خورشید احمد ندیم/ڈاکٹر محمد فاروق خانؒ

☆ دینی مدارس اور عصر حاضر (الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام فکری نشستوں کی روداد)

مرتب: شبیر احمد خان میواتی

☆ عصر حاضر میں اجتہاد - چند فکری وعملی مباحث از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ مذہبی جماعتیں اور قومی سیاست از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ اطراف - دینی تعبیر کے چند نئے گوشے (مجموعہ مقالات) از: میاں انعام الرحمٰن

☆ متحدہ مجلس عمل - توقعات، کارکردگی اور انجام از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ جنرل پرویز مشرف کا دور اقتدار از: ابوعمار زاہد الراشدی

☆ اسلام اور انسانی حقوق (اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں) از: ابوعمار زاہد الراشدی

”جن امور میں ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ اصول اجتہاد کے دائرے میں رہتے ہوئے آج کے عالمی عرف اور بین الاقوامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ایڈجسٹمنٹ کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور مسائل وامور کے پوری طرح تجزیہ وتنقیح کے بعد جو موقف واضح ہو کر سامنے آئے، اسے مغرب کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ پیش کر کے اس کے لیے عالمی سطح پر لابنگ اور ذہن سازی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اسلام کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں اور آج کے ماحول، عالمی عرف اور بین الاقوامی اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں۔“

الشریعہ اکادمی

www.alsharia.org